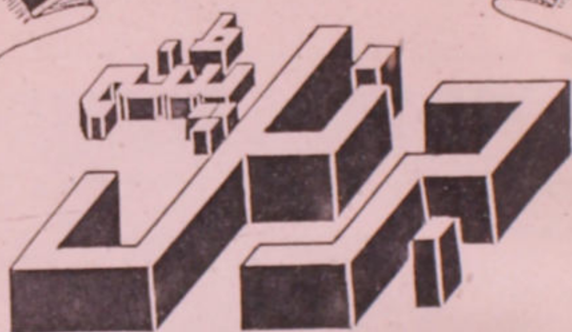
خدا بخش لائبریری





خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۳۳۴۴۴/۷۷

شمارہ: چوالیسواں

قیمت: ۱۵ روپے

قیمت فی شمارہ : ۱۵ روپے

سالانہ : ۶۰ روپے (ہند)

: ۱۲ ڈالر (ایشیا)

: ۲۴ ڈالر (دیگر ممالک)



فہرست



۱۹۸۷ء

جرنل کے خریداروں سے

سال کا آغاز طاق سے مناسب معلوم ہوتا ہے

اس لیے نمبر ۴۴ جو جنوری ۱۹۸۸ء کا پہلا پرچہ ہونا تھا

دسمبر ۸۷ء ہی میں شائع کر کے ہم آپ سے اپنی گنتی کو مناسب

تر اعداد پر لانے کی اجازت چاہتے ہیں۔ ۱۹۸۸ء سے

قیمتوں میں اضافے کی بنا پر جرنل کا زرِ سالانہ ساٹھ رُپے کے

بجائے ستّر رُپے ہوگا اور جرنل کو آفسٹ پر شائع کر کے

پیش کیا جائے گا۔ لہٰذا ۱۹۸۸ء کا جنوری۔ مارچ کا جرنل نمبر ۴۵ ہوگا۔

مرزا عبدالقادر بیدل

پروفیسر شاہ عطاءالرحمٰن عطا کاکوی

مترجم

مرزا بیدل کہ رہنمائی سخن است   پیغمبر و غوث و پیشوای سخن است
یکتاست در آفریدنِ طرزِ کلام   باللہ کہ پئے سخن خدای سخن است

یہ اس شخص کی رباعی ہے جس کو بیدل سے والہانہ تعلق تھا۔ جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بیدل کی صحبت میں گزارا۔ خود اس کا قول ہے کہ اس نے بیدل سے ایک ہزار سے زیادہ بار ملاقات کی ہے۔ بیدل کی زندگی کے شب روز کا وہ محرم ہے۔ اس نے بیدل کو پورے طور پر پرکھا۔ خود ان سے معلومات حاصل کیں۔ اس لئے اس کا بیان ایک معتبر راوی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

"بیدل قوم مغول کے قبیلہ ارلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ تورانی الاصل اکبرآبادی الوطن۔ طاہر نصرآبادی کا قول کہ وہ لاہوری تھے ساقط الاعتبار ہے۔

خوشگو نے یہ بات واضح نہیں کی کہ بیدل کے اجداد ہندوستان کب آئے اور کہاں قیام پذیر ہوئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ سلجوقیوں کے مختلف قبیلوں کی خانہ جنگیوں کے دوران بیدل کے اجداد ہندوستان آکر اکبرآباد (آگرہ) میں متوطن ہوئے۔ کیونکہ اس زمانے میں ہند کا دارالسلطنت اکبرآباد ہی تھا اور یہیں فراغت کے مواقع تھے۔

بیدل کے اوپر کے بزرگوں کا نہ نام معلوم ہے نہ نشان۔ ان کے والد مرزا عبدالخالق پہلے کہیں ملازمت میں منسلک ہو گئے مگر آخیر عمر میں وہ ترک لباس کر کے صوفی [illegible] بن گئے۔ اور حضرت شاہ کمال قدس سرہ ساکن رانی ساگر کے معتقد ہو کر سلسلہ قادریہ میں شرف بیعت سے سرفراز ہوئے۔

بیدل کے مقام پیدائش کا فیصلہ عرصہ تک متنازع [illegible] دور اور ما بعد کے قریب قریب کل تذکروں میں ان کی پیدائش عظیم آباد کی بتائی گئی ہے اور [illegible] بیدل کے نام کے ساتھ عظیم آبادی ایک جزو لاینفک بن گیا۔ اور آج تک وہ اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں [illegible] صحیح نہیں ہے۔

میرے استاد محترم شاد عظیم آبادی جو بیدل سے تقریباً [illegible] سو سال بعد پیدا ہوئے وہ بغیر

کسی اسناد کے بیدل کو پٹنہ کے محلہ پٹنی دیوی کا باشندہ قرار دیتے ہیں۔ استاد محترم بڑے سخنور ہونے کے ساتھ بڑے سخن ساز بھی تھے۔ انھوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جب وہ پٹنہ کو خیر باد کہہ رہے تھے تو ایک ان کی جانی پہچانی سبزی فروش نے ایک دوہا بھی برجستہ کہہ کر سنایا:

سر اوپر کوئی نہیں تب دشمن آین کیس   پٹنہ نگری چھاڑ دیں اب بیدل چلے بدیس

اور پھر بیدل نے اس کا جواب بھی دیا۔

اس روایت کو معتبر سمجھ کر نہ جانے بہار کے کتنے اہل قلم اپنے مقالوں میں نقل کرکے ادبی اور تاریخی مجرم بنے ہیں۔

بیدل نے پٹنہ (۱۰۷۴ھ) میں چھوڑا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۰ سال کی تھی 'رہبر خدا بس' (۱۰۷۴ھ) تاریخ ہے۔ خوشگو لکھتا ہے کہ مرزا بیدل کا ابتدائی تخلص رمزی تھا اور وہ شاہ کمال سے استفادۂ شعری کرتے تھے۔ اور ایک مدت تک اسی تخلص سے شاعری کرتے تھے۔ ایک عرصے کے بعد جب وہ گلستاں کا مطالعہ کر رہے تھے تو ان کی نظر اس مصرعہ پر پڑی ؎ بیدل از بی نشاں چہ گوید باز

تو انھوں نے بیدل تخلص اختیار کیا۔ یہ پٹنہ سے چلے جانے کے بہت بعد کا واقعہ ہے۔ اب اس کبڑون کا وہ دوہا کیسے قابل قبول ہوگا۔

بیدل کی پیدائش کا مسئلہ اب یوں طے پا گیا کہ ان کی ولادت سرحد بہار و بنگال کے ایک مقام راج محل میں واقع ہوئی۔ اکبر کا فوجی مستقر ہونے کے باعث جس کا نام اکبر نگر رکھا گیا تھا۔

خوشگو کی مانند بیدل کا ایک اور ہم جلیس و ہمراز تھا جس کا نام وارد ہے اس نے ایک تذکرہ مرآۃ واردات لکھا ہے۔ اس کا اقتباس لچھمی نرائن شفیق نے اپنے تذکرہ شام غریباں میں درج کیا ہے۔ اس میں یہ بات صاف طور سے لکھی ہے کہ بیدل کا مقام پیدائش راج محل عرف اکبر نگر (صوبہ بنگالہ) ہے۔ (یہ الگ بات ہے اور دلچسپ بھی کہ مرآۃ واردات کا اصل مخطوطہ جو بیدار صاحب نے دیکھا اس میں یہ عبارت بیدار صاحب کے بقول کہیں نہیں ملتی ہے)

بیدل کے ابتدائی حالات

بیدل کے والد کا نام عبدالخالق تھا جو شاہزادہ شجاع صوبہ دار بنگال کی فوج میں ملازم تھے۔ ابتدا ہی سے فقر و سلوک کی طرف مائل تھے۔ ترک ملازمت کے ساتھ ترک لباس بھی کیا اور شاہ کمال کے مرید ہوگئے

بیدل ان کی پیری میں پیدا ہوئے۔ ابھی چار ہی سال کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے جاتا رہا:

خورشید خرامید و فروغے ز نظر ماند   دریا بہ کنار دگر افتاد و گہر ماند

ماں کی آغوش میں قرآن پڑھنا شروع کیا۔ ناظرہ ختم کیا تھا کہ والدہ بھی اس جہان سے رخصت ہو گئیں اور بیدلؔ ماں باپ دونوں کی شفقت سے محروم ہو گئے۔

بیدلؔ کی پیدائش ۱۰۵۴ھ میں ہوئی۔ شاہجہاں کا زمانہ تھا۔ لفظ "انتخاب" سے تاریخ پیدائش برآمد ہوتی ہے اور یہ اشارہ غیبی تھا کہ بیدلؔ کو انتخاب روزگار ہونا تھا۔

بیدلؔ اب اپنے حقیقی چچا مرزا قلندر کی تربیت میں رہے۔ وہ بڑے شہ زور اور شجاع تھے شہزادہ شجاع کی فوج میں ملازم تھے۔ جو خود تو ان پڑھ تھے مگر بھتیجے کی تعلیم کا ان کو بہت خیال تھا۔ ان کو مدرسہ میں داخل کر دیا۔

ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ مرزا قلندر کی زندگی کا پرتو بیدلؔ کی شخصیت کی تعمیر میں اثر انداز ہوا۔

مرزا قلندر بڑے قوی ہیکل بسیار خوراک اور ریاضت کے شائق تھے۔ ان سے دو کرامتیں بھی ظاہر ہوئی تھیں۔ ایک عقرب کی بے بسی دوسرے قفل کشائی۔ ایک کا سبب ازلی تھا دوسرے کا سبب وردِ "یا فتاح"۔ قوت ایسی کہ گھوڑے کے ایال پکڑ کر معلق اٹھا لیتے تھے۔ پانچ سیر گرم گھی اٹھا کر پی جاتے تھے۔ دس آدمی کا کھانا اکیلے نوش جان فرماتے تھے۔ مگر اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ہفتوں فاقہ بھی کرتے۔ یہ بھی شاہ کمال کے مرید تھے اور جب رانی ساگر جاتے تو بیدلؔ کو بھی ساتھ لے جاتے۔ بیدلؔ بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔

بیدلؔ کو چچا نے مدرسہ میں تعلیم کے لئے داخل کیا۔ وہاں د[illegible] کافیہ تک پڑھ چکے تھے اور شرح ملا شروع کر چکے تھے۔ اس وقت ان کی عمر دسویں سال میں تھی۔ شاعری کا شوق وہیں پیدا ہوا۔ اور ایک رباعی اپنے ہم مکتب کی تعریف میں لکھی۔ لوگوں کو بڑا تعجب تھا کہ [illegible]ادر رباعی بڑا مشکل فن ہے۔

ایک بار مرزا قلندر مدرسہ گئے۔ بیدلؔ بھی وہیں تھے۔ دیکھا [illegible] دو طالب علم آپس میں مباحثہ کر رہے ہیں۔ مباحثہ مجادلہ بن گیا اور قریب تھا کہ مقاتلہ بن جائے۔ [illegible]نگ دیکھا تو چچا نے بھتیجے کا کان پکڑا اور مدرسہ سے واپس لے آئے کہ:

گر ہمیں مکتب است ہمیں ملاؔ   کار طفلاں تمام خو[illegible] شد

مرزا قلندر کو اپنے بھتیجے کی تعلیم کی بڑی فکر تھی۔ انھوں نے ان کو تاکید [illegible] اساتذہ کے کلام اور صوفیائے کرام

کی تصانیف کا برابر مطالعہ کیا کرو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بیدل نے جو کچھ سیکھا وہ یا تو کتب کے مطالعہ سے یا پھر باکمالوں اور مجذوبوں کی صحبت سے:

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

غرض کہ بیدل ہیں اور عرفا و باکمال صوفیائے کرام کی صحبت ، شاہ کمال کی صحبت سے ابتدا ہی میں فیضیاب ہوئے انہی سے شعر و شاعری میں اصلاح لی۔ رمزی تخلص پایا اور انہی سے ورود وظائف تعویذ اور نقوش کے بھی اسرار سیکھے اور اسی پر عامل رہے۔

بیدل کی رسمی تعلیم گویا نہ ہونے کے برابر ہے۔ مدرسہ کی ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے چچا میرزا قلندر کے حکم سے حکما و شعرائے سلف کے رشحات قلم کا مطالعہ کرتے رہے۔ پھر شاہ کمال کی صحبت سے فیض یاب ہوئے یہ حضرت بیدل کے باپ اور چچا کے پیر و مرشد تھے۔ انہی کی صحبت میں بیدل نے شاعری کے ابتدائی منازل طے کئے اور رمزی تخلص رکھا۔ شاہ صاحب موصوف صاحب کمال صوفی اور صاحب کشف و کرامات تھے۔ ایک اور صوفی بزرگ جو اہل سلوک میں سے تھے اور اڑیسہ میں رہتے تھے جن کا نام تھا شاہ قاسم ہوا اللہ۔ یہ بھی ایک برگزیدہ سالک فقیر تھے۔ بیدل اپنے ماموں مرزا ظریف کے ساتھ کٹک میں ان سے ملے۔ ان دونوں سالک بزرگوں کے علاوہ چند مجذوب فقرا سے بھی بیدل مختلف وقتوں میں دو چار ہوئے اور ان کی صحبتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ فقیروں سے ملاقات کا شوق بیدل کو ابتدا ہی سے تھا۔ خود بھی ان کا ہی ذوق تھا۔ خرق عادات اور کشف و کرامات کے افسانے چہار عنصر میں بکھرے پڑے ہیں۔ خود بیدل نے بھی ان مجانین کے خرق عادات کے ساتھ ساتھ اپنے کشف و کرامات کے واقعات بھی قلم بند کئے ہیں۔ آج کے اہل علم ان کو مشکل ہی سے باور کر سکیں گے۔ جو لوگ ان کو نہیں مانتے ان کے لئے کہا گیا ہے۔ شعر ذوق ایں بادہ نہ دانی بہ خدا تا نہ چشی

تصوف کی راہیں الگ ہیں اور ان کا تعلق کرنے سے ہے کہنے سے نہیں۔ سالکوں کے علاوہ جن مجذوبوں سے بیدل نے اپنی شیفتگی کا اظہار کیا ہے ان کے نام یہ ہیں:

(۱) شاہ ملوک (دراتی ساگر) (۲) شاہ فاضل۔ (۳) شاہ یکہ آزاد (۴) شاہ کابلی۔

یہ بھی ایک طرفہ تماشا ہے کہ جتنے اہل اللہ کا بیدل نے بیان کیا ہے ان کا کسی اور کتاب میں ذکر نہیں ملتا ہے۔

تصانیف نظم و نثر

بیدل کی تصانیف نثر و نظم کا اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔ ہر تصنیف کے بارے میں اگر تنقیدی جائزہ لیا جائے تو دفتر درکار ہے۔ پہلے نثری تصانیف کو لیجئے :۔

ا۔ چہار عنصر :۔ یہ بیدل کی سوانح عمری تو نہیں پھر بھی ان کی آپ بیتی کا دلکش اور معتبر مرقع ہے۔ یہ چار حصوں میں ہے اور یہ بیس سال کے عرصہ میں لکھی گئی۔ تکمیل ۱۱۱۶ھ میں ہوئی۔

۲۔ رقعات بیدل :۔ ۲۷۳ رقعات کا مجموعہ ہے جو بیدل نے اپنے احباب و اعزہ اپنے کرم فرماؤں اور حلقہ بگوشوں کو لکھے۔ یہ نثر کا بہترین نمونہ ہے مگر اسلوب نگارش میں "بیدلیت" ہے۔

۳۔ نکات بیدل :۔ یہ بیدل کے تاثرات، تجربات، مشاہدات اور وجدان کا لب لباب اور نچوڑ ہے۔ جملے مختصر مگر بڑے معنی خیز۔ پھر ان کا تشریح اشعار ہیں۔ بیدل کی یہ بڑی بے نظیر کتاب ہے اس کا انگریزی ترجمہ جانسن پاشا نے ترجمہ گلشن راز و رباعیات خیام کے ساتھ ساتھ ڈبلن سے ۱۹۰۸ء میں شائع کیا۔

نظم میں حسب ذیل تخلیقات ہیں :۔

ا۔ مجموعہ غزلیات :۔ اشعار کی تعداد پچاس ہزار کے قریب

۲۔ رباعیات :۔ دو ہزار

۳۔ قصائد و مخمسات :۔ ترکیب بند اور ترجیع بند۔ متعدد

۴۔ مثنوی محیط اعظم :۔ بر وزن شاہنامہ۔ جو بیس سال کی عمر میں تمام ہوئی۔ اشعار چھ ہزار

۵۔ طلسم حیرت :۔ ایک تخیلی مثنوی، حقایق و معارف سے لبریز۔ جامی کی یوسف زلیخا کی طرح

۶۔ طور معرفت :۔ مناظر قدرت کی عکاسی۔ تین ہزار اشعار۔ چند دنوں میں لکھی گئی۔

۷۔ عرفان :۔ اس میں گیارہ ہزار اشعار ہیں۔

۸۔ مثنوی تنبیہ المومنین :۔ ایک ہزار اشعار۔

(کل تعداد ابیات ایک لاکھ سے زیادہ

ملازمت اور ترک ملازمت

ایک غلط فہمی کا ازالہ: جناب شاد سخن گو تو تھے ہی مگر سخن ساز بھی تھے۔ انھوں نے بیدل کو پٹنہ کا باشندہ اور پٹنہ دیوی خانہ میں قیام بتایا ہے۔ ان کے پوتے نقی احمد ارشاد نے بغیر کسی سند کے ان کو مدرسہ سیف خاں کا متعلم قرار دیا ہے۔ یہ بے بنیاد بات ہے۔

اب بیدل جوان ہو چکے ہیں۔ اسباب معاش کی فکر ہوئی۔ اعظم شاہ کے دربار سے متوسل ہوئے ترکی اور فارسی زبان پر قدرت تھی اپنی قابلیت کی بنا پنج ہزاری کے منصب پر فائز ہوئے اور داروغہ لنگر خانہ مقرر ہوئے۔ بڑی تمکنت سے بسر ہوتی تھی اور تقریباً ۲۰ سال تک ملازمت میں رہے، مگر دماغ میں استغنا اور قناعت کا جذبہ تھا۔ فقیروں کی صحبت میں دنیوی بندگی سے دل برگشتہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک ایسا امر ناگوار واقع ہوا جس سے وہ ترک ملازمت پر مجبور ہوئے۔

اب یہ متھرا پہنچتے ہیں اور وہاں شاہ محمد شفیع وارد سے ارتباط کی بنا پر ان ہی کے یہاں قیام کرتے ہیں (تفصیل شام غریباں میں) اعظم شاہ نے بکمال محبت دوبارہ طلب کیا خوشگو نے وہ خط دیکھا تھا۔ مگر بیدل بد دل ہو چکے تھے اس لیے نہ آئے۔

اب آزادانہ طور پر بیدل سفر کرتے رہے۔ کبھی اکبر آباد، کبھی بہار، بنگال، اڑیسہ، ترہت آرہ، راتی ساگر، بابا حسن ابدال وغیرہ کی سیر کرتے رہے۔ مشاہدات عالم نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔ فطرت ان کی درسگاہ تھی۔ بہت کچھ تجربات حاصل کئے ؎

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

نواب شکر اللہ خاں سے روابط بڑھے انھوں نے اپنے پاس بلا لیا اور پانچ ہزار روپے میں ایک حویلی گزر گھاٹ بیرون دروازہ دہلی محلہ کھیکھریاں میں خرید کر کے بیدل کے نذر کی۔ اسی میں بیدل نے بہ اطمینان تمام زندگی کا بقیہ عمر بسر کی۔ نواب مذکور نے دو روپیہ روزانہ ان کا روزینہ مقرر کر دیا۔ اسی حویلی میں امرا و رؤسا بھی آتے رہے اور شعرا و ادبا بھی آکر فیض یاب ہوتے رہے۔ شاگردوں کا بھی مجمع تھا۔ تقریباً تین سو شعرا ان کے شاگرد تھے۔ آصف جاہ حکمران دکن بھی ان میں سے ایک تھا۔

بیدلؔ نے ایک چھوڑ کر چار شادیاں کیں۔ (یکے بعد دیگرے یا بیک بار۔؟) بڑھاپے تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ آخر ۶۶ سال کی عمر تھی کہ خدا نے ایک عصائے پیری عنایت کیا۔ نام دادا کے نام پر عبدالخالق رکھا گیا مگر چار[۷] ہی سال کی عمر تھی کہ خالق نے دونوں عبدالخالق کو عدم میں ملا دیا۔ (بیٹے کا مرثیہ بیدلؔ نے لکھا) بالآخر اناسی[۹] اسّی[۸] سال کی عمر میں ۴ صفر ۱۱۳۳ھ کو علم و عرفان کا یہ پیکر، شاعر، فلسفی اور صوفی، استغنا و قناعت کا مجسم مرقع اس دنیائے آب و گل سے روپوش ہو کر وہاں چلا گیا جہاں سے آج تک کوئی واپس نہ آیا۔ اپنی اسی حویلی میں پہلے ہی سے اپنی قبر کی جگہ متعین کر چکے تھے اسی میں سپرد خاک ہوئے۔ ایک عرصہ تک[۱۰] ان کا عرس بڑے کرو فر سے منایا جاتا تھا اور مشاعرہ ہوتا تھا۔

بیدلؔ کا مزار اور عرس

مقبولیت کا یہ بھی ایک ثبوت ہے کہ مختلف مقامات کے لوگ نہ صرف جیتے جی بلکہ مرنے کے بعد بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مرنے والا ان ہی کے ملک میں مدفون بھی ہے۔ کابل والے بیدلؔ کے شیدائی تھے۔ عقیدت مندی اور شیفتگی کے باعث انھوں نے دعویٰ کیا کہ بیدلؔ کابل میں مدفون ہیں۔ یہی حال ان کی پیدائش کے مقام کے تعین کا ہے۔ کوئی بخارا بتاتا ہے۔ کوئی اکبر آباد، کوئی عظیم آباد، کوئی لاہور۔ غرض جہاں جہاں بیدلؔ گئے، رہے، سے منسوب ہو گئے۔ متفقہ طور پر یہ تو پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ بیدلؔ دلی ہی میں مدفون ہیں، مگر کہاں ہیں؟ یہ بھی محقق ہے کہ وہ اپنے سکونتی مکان واقع محلہ کھیکھریاں گزرگھات بیرون دروازہ دلی جمنا کے کنارے مدفون ہوئے۔ مگر اب نہ اس مکان کا پتہ ہے نہ نشان۔ خواجہ حسن نظامی نے نظام حیدرآباد کے عطیہ سے ایک نمایاں جگہ پر ان کا مزار انداز سے بنوا دیا۔ اب بیدلؔ کے صحیح مزار کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ بیدلؔ زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ:

بعد از وفات تربتِ ما در زمیں مجو ۔۔۔ در سینہ ہائے [illegible] عارف مزار ماست

اب بیدلؔ کی خاک کا بھی پتہ نہیں:۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا ۔۔۔ یادگارِ رونقِ [illegible] تھی پروانے کی خاک

اب وہ نہ مردم عارف رہے نہ تربت کا نام و نشان۔

بیدلؔ اپنے وقت کے نہ صرف ایک شاعر بلکہ [illegible] بلند پایہ صاحبِ عرفان اور [illegible] کشف

وکرامات بزرگ بھی سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے عقیدت مندوں کا ایک بہت بڑا حلقہ تھا۔ مرنے کے بعد بیدل کا سالانہ عرس بھی بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا۔ اور اس کا سلسلہ ۴۰، ۵۰ سال تک رہا۔ شعرا جمع ہوتے۔ طعام داری ہوتی۔ سب سے پہلے بیدل کا کلام پڑھا جاتا۔ ان کا مرتب کردہ دیوان مزار پر رکھا رہتا اور ان کا آہنی سونٹا بھی۔ ملک کی افراتفری کے باعث نہ وہ لوگ رہے نہ وہ عقیدت مندی کا جذبہ۔ عرس کون کرتا۔

عبدالولی عزلت جب ۱۱۶۴ھ میں دہلی آئے تو عرس میں شریک ہوئے اور از راہ عقیدت دیوان بیدل سے اس بات کا پتہ لگانا چاہا کہ آیا بیدل کو بھی ان کی آمد کی اطلاع ہوئی یا نہیں۔ عجیب اتفاق کہیے یا کرامت، یہ شعر دیوان سے نکلا:

چہ مقدار خوں در عدم خوردہ باشم　　کہ بر خاکم آئی و من مردہ باشم

اب اس شعر کے بعد عزلت کے دل پر بیدل کی عظمت و بزرگی کا سکہ کیسے نہ بیٹھا ہوگا۔

بیدل اپنے باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ خود بیدل بھی بے اولاد اس دنیا سے چل بسے۔ بڑھاپے میں ایک لڑکا ہوا بھی تو وہ بھی چار سال کا ہو کر داغ مفارقت دے گیا۔

اب ان کے رشتہ داروں کے افراد کا بھی کہیں پتا نہیں چلتا۔ ان کا کلام ہی ان کی معنوی اولاد ہے اور اسی سے بیدل زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

بیدل کا ایک معتبر ماخذ

خوشگو کے بعد بیدل کا معروف شناسا شاہ محمد شفیع وارد ہے۔ یہ حیدی طہرانی کا نواسا تھا۔ شاعر بھی تھا اور اس نے ایک تذکرہ مراۃ واردات کے نام سے لکھا ہے۔ اس میں بیدل کا کچھ حال تفصیل سے ملتا ہے اور قابل اعتبار ہے۔ یہ تذکرہ نایاب سمجھا جاتا تھا مگر شفیق کے تذکرہ شام غریباں کی اشاعت کے بعد یہ امر واضح ہوا کہ اس میں شفیق نے وارد کا بیان شائع کر دیا ہے۔ ضمناً یہ عرض کرنا ہے کہ یہ تذکرہ ٹونک میں موجود ہے، اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی نظر سے گزرا ہے مگر ان کا بیان ہے کہ بیدل کا ذکر اس تذکرہ میں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شفیق کے پاس اس کا دوسرا کوئی نسخہ ہو جو اب ناپید ہے بہرکیف اس سے شفیق کے بقول یہ اطلاع ملتی ہے کہ:۔

(۱) بیدلؔ اکبر نگر معروف بہ راج محل بنگال میں پیدا ہوئے۔ (بہار کا بھی وہ ذکر کرتا ہے اس لیے
کہ اس وقت بہار و بنگال ایک ہی گھر کے دو آنگن تھے۔)

(۲) عہد جوانی میں وہ بنگال سے ہندوستان کی طرف گئے اور سب سے پہلے وہ مرزا سلیمان
سے وابستہ ہوئے جو سلطان معز الدین (خلف عالم گیر) کے حقیقی ماموں تھے۔ چند سال بیدلؔ وہاں رہے
پھر اعظم شاہ سے وابستہ ہوئے۔

(۳) ترک ملازمت:۔ کسی نے ایک دن کچھ اشعار بیدلؔ کے اعظم شاہ کو سنائے
پوچھا کہ کس کے اشعار ہیں۔ جب معلوم ہوا کہ بیدل کے ہیں تو از راہ مزاح فرمایا کہ یہ حضرت ہمارے لشکر میں
ہیں جہاں سب اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں، شعر و شاعری کا وہاں کیا کام۔ یہ خبر بیدلؔ کو ملی تو نازک
مزاجی سے ترک ملازمت کیا اور متھرا چلے آئے۔ وہاں کا حاکم لعل محمد تھا۔ اس نے بیدلؔ کی بڑی دلجوئی اور
خاطر داری کی۔ اتفاقاً عالم گیر نے لعل محمد کو دکن طلب کیا، وہ روانہ ہو گیا۔ اسی اثنا میں بیدلؔ شاہ وارد کے
یہاں سال ڈیڑھ سال رہے۔ پھر نواب شکر اللہ خاں سے مراسم پیدا ہوئے اور انھوں نے بیدلؔ کو میوات
بلا بھیجا۔ وہاں چلے گئے۔ وارد کا بیان ہے کہ بیدلؔ نے اپنا نسب شاہ منصور ممدوح حافظ سے جا ملایا ہے۔
منصور کے قتل کے بعد اس کے عزیز اقارب بخارا چلے گئے۔ بیدلؔ کے ایک پشت اوپر کے لوگ بنگال میں
آ کر بسے اور یہیں بیدلؔ پیدا ہوئے۔ مرزا ظریف بیدلؔ کے ماموں تھے۔ بیدلؔ کے والد مرزا عبدالخالق
بنگال میں سکونت پذیر ہوئے تو کیا عجب کہ یہیں کسی بنگالن سے ان کا عقد مناکحت ہوا ہو۔

بیدلؔ کے پٹنہ کے قیام کے بارے میں وارد خاموش ہے۔ بیدلؔ نے اس کے متعلق کچھ نہیں
بتایا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیدلؔ کا تعلق پٹنہ اور نواح پٹنہ سے بس سرسری طور پر رہا ہوگا اور
اپنے چچا مرزا قلندر کے ساتھ کبھی پٹنہ، کبھی آرہ، کبھی رانی ساگر، کبھی [illegible]ہٹ غرض ادھر ادھر پھرتے
رہے۔ مرزا قلندر فوج میں ملازم تھے۔ شاہزادہ شجاع بادشاہ بننے کی [illegible] میں غلطاں و پیچاں تھا۔ مرزا قلندر
کے انتقال کے بعد مرزا بیدلؔ اپنے ماموں مرزا ظریف کے ساتھ اڑیسہ [illegible]

بیدلؔ کی شاعری

بیدل ایک فلسفی شاعر تو ہے۔ مگر فلسفہ کو شعر کے سانچے میں [illegible] کا فن بیدلؔ کا وہ امتیاز ہے۔

وہ سراپا صوفی شاعر بھی ہے مگر اس کے تصوف میں حرکت ہے، انجماد نہیں۔ جوش ہے سکون نہیں۔ ولولہ ہے مایوسی نہیں۔ پیغام عملی ہے، بے دست و پائی نہیں۔ فطرت کی جلوہ سامانیاں، حقیقت کی نور افشانیاں، کائنات کی بوقلمونیاں، تحیر کی آئینہ سامانیاں، بیدلؔ کے کلام کے اہم اجزا ہیں۔ الفاظ کی رنگینی، معانی کی حسن آفرینی، لب و لہجہ کی ہم آہنگی سب نے مل جل کر اس کے کلام میں سحر آفرینی کی ایک ایسی مثال پیش کی ہے جس سے متقدمین سے لے کر متاخرین تک کا کلام خالی ہے۔ بیدلؔ کو شوکتؔ بخاری اور جلالؔ اسیر کا ہم نوا سمجھنا نہ صرف بیدلؔ کی توہین ہے بلکہ خود اپنی بد ذوقی کا برملا اعلان بھی ہے۔ بیدلؔ نے اپنے قلم کی گل کاری کو آئینہ گری سے تعبیر کیا ہے:

از حیرت دل بند نقاب تو کشودیم — آئینہ گری کار کمی نیست دریں جا

بیدلؔ کو اس کے ہم عصروں نے بھی مانا اور سراہا ہے۔ غلام علی آزادؔ کہتے ہیں:

رساند پایۂ معنی بر آسمانِ ہُنم — بلند طبع شناسد کلام بیدلؔ را

نجیب خاں طغرلؔ کہتا ہے:

بہ رفعت برتر است از کوہ طغرلؔ — جناب حضرت مرزای بیدلؔ

خوشگو کا ایمان ہے کہ:

یکتاست در آفریدنِ طرزِ کلام — باللہ کہ پئی سخن خدای سخن است

خود بیدلؔ کی اپنی خود شناسی ان اشعار سے ظاہر ہوتی ہے:

باکمال آبدارت کے رسد لاف گہر — بیدلؔ ایں جا اعتبارے نیست حرف تر ترا

بیدلؔ از فطرت ما قدر معانی ست بلند — پایہ دارد سخن از کرسی اندیشۂ ما

مدعی در گزر از دعویٔ طرز بیدل — سحر مشکل کہ بہ کیفیت اعجاز رسد

تب و تاب اشک چکیدہ ام کہ رسد بہ معنی راز من — ز شکست شیشۂ دل مگر شنوی حدیث گداز من

بیدلؔ کی ریختہ گوئی

بیدلؔ فارسی کے صاحب طرز شاعر تھے مگر منہ کا مزا بدلنے کے لیے ریختہ گوئی بھی کی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ فارسی گو شعرا اردو کی طرف مائل ہو چلے تھے۔ بیدلؔ کے انتقال کے تیئس سال بعد میرؔ نے تذکرہ

نکات الشعراء میں پہلے پہل بیدل کو بہ حیثیت اردو شاعر روشناس کیا اور ان کے زاید از یک کے صرف دو شعر نقل کیے۔ یہی بیدل کی اردو شاعری کی کائنات سمجھی جاتی تھی۔ چار پانچ سال ہوئے جب مجھے پاکستان جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں یہ خبر ملی کہ ایک شخص غلام کبریا خاں افغانی کے پاس ایک بیاض میں بیدل کی ایک مکمل اردو غزل دستیاب ہوئی مطلع اور مقطع تو وہی ہے جو عام تذکروں میں ملتا ہے مگر اس غزل کے تین شعر اور ملے۔ اب یہ مکمل غزل بیدل کی نادر یادگار ہے۔ اس کا تو امکان نہیں کہ بیدل نے صرف یہی غزل کہی ہوگی۔ غزل اپنے رنگ میں "بیدلیت" کی غمازی کر رہی ہے۔ بیدل نے اردو کی طرف سے بے اعتنائی برتی۔ اگر اور خامہ فرسائی کرتے تو اردو میں نہ جانے کتنے لعل و گوہر ہاتھ آتے۔ پوری غزل سن لیجیے:

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم میں

موجوں کی زد میں آئی جب کشتیٔ تعین
بحر فنا پکارا ساحل کہاں ہے ہم میں

خارج نے کی ہے پیدا تمثال آئینے میں
جو ہم میں ہے نمایاں، داخل کہاں ہے ہم میں

سوز نہاں میں کب کا وہ خاک ہو چکا ہے
اب دل کو ڈھونڈتے ہو، اب دل کہاں ہے ہم میں

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

آپ نے دیکھا؟ خیالات میں کتنی گہرائی، بیان میں کتنی صفائی، بندش میں کتنی پختگی یہ اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟

شاہ ملوک ایک مجذوب فقیر رانی ساگر کے آس پاس رہتے تھے۔ جہاں شاہ کمال قدس سرہ کا تکیہ تھا۔ بیدل اپنے عنفوان شباب میں شاہ ملوک سے دوچار ہوئے۔ وہ حالت جذب میں موزوں کلمات فارسی اور بھاکا کے ملے جلے "فالبتہ" اپنی زبان سے ادا کرتے تھے اور بیدل کو لکھوا دیا کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہی منظوم کلمات کا یہ اثر تھا کہ بیدل بھی زبان ریختہ میں طبع آزمائی کرتے ہوں۔ افسوس

ہے کہ سرمایہ مفقود ہو گیا یا خود بیدل نے ان کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور ضائع کر دیا۔

بیدل کا روزانہ کا مشغلہ

قوت اور زور کا یہ عالم تھا کہ روزانہ چار ہزار یا پانچ ہزار بار ڈنڈ اور بیٹھکیں کرتے تھے۔ کشتی لڑنے کا بھی شوق تھا۔ مخالف کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دے پٹکتے تھے۔ ایک بار ایک حجام چنچ کو ایک طمانچہ رسید کیا تو وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ایک بار پاؤں میں لغزش ہوئی ایک دیوار کا سہارا لیا، وہ دیوار الٹ گئی۔ ہاتھ میں لوہے کا سونٹا جس کو نولاسی کہتے تھے اور جو ایک من سے زیادہ وزن کا تھا رکھتے تھے۔ آدمی سے کشتی لڑنا تو الگ رہا، گھوڑے سے کشتی لڑتے اور اپنی قوت سے اس کو پشتہ سے گرا دیتے۔ ایک بار دوڑنے میں گھوڑے کا مقابلہ کیا اور گھوڑے سے آگے نکل گئے۔

غذا بھی ماشاءاللہ اچھی خاصی تھی۔ جوانی میں سات آٹھ سیر نوش کر جانا معمولی بات تھی۔ کبر سنی میں غذا کچھ کم ہو گئی تھی، تو بھی ڈھائی تین سیر ضرور ہوتی تھی۔

عالم شباب میں مشروب و بنگ سے شغل کرتے تھے، مگر بڑھاپے میں ترک کر کے دو معجون بنام ارجی موجی نوش کرتے تھے۔

حقہ پیتے تھے۔ یار آشنا شب کو بیدل کے مکان پر جمع ہوتے۔ گفتگو آہستہ کرتے تھے۔ مگر اشعار بلند آواز سے سناتے تھے کہ راستہ چلنے والے بھی بخوبی سن لیتے تھے۔ اپنی غزل سناتے دوسروں کی غزلیں سنتے۔ چنانچہ ادھر ادھر کی باتیں بھی ہوتیں، اسرار و رموز تصوف پر روشنی ڈالتے۔ خوشگو نے بیدل کے ملفوظات بھی جمع کیے تھے۔ افسوس کہ وہ کتاب اب تک نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔

بیدل کی پذیرائی

خوشگو کہتا ہے کہ بیدل کا کاشانہ خواص و عوام کا مرجع تھا۔ عوام تو عوام خواص و امرائے عظام بھی اس کی زیارت کو اپنے لیے باعث تکریم سمجھتے تھے۔ قطب الملک سید عبداللہ وزیر اعظم نے کئی بار اپنے یہاں بیدل کو قدم رنجہ ہونے کی دعوت دی۔ ان سے مراسم تھے۔ بیدل جب جاتے تو قطب الملک اپنی مسند خالی کر کے بیدل کو بٹھاتے، بڑی عزت سے پیش آتے۔ آصف جاہ بانی سلطنت دکن تو ان کا شاگرد ہی تھا۔ بڑی

عقیدت سے ملتا۔ اکثر بیدؔل کے یہاں جاکر مرغ کے انڈے کا حلوا کھاتا۔ فرخ سیر نے بھی ملنا چاہا مگر جب معلوم ہوا کہ بیدؔل بادشاہوں سے ملنا نہیں چاہتے تو دو ہزار نقد روپے اور ایک زنجیر فیل بہ طور تحفہ بھیجا۔ بیدؔل نے روپیہ تو خیر لے لیا مگر ہاتھی ہاتھ نہ آیا۔ اس لئے کہ اس کے لانے کے لئے کسی کو بھیجا ہی نہیں منصبدار لوگ پورا ہاتھی ہضم کر لیا۔

بہادر شاہ اول نے اپنے وزیر منعم خاں کو بار بار بیدؔل کے پاس بھیجا کہ وہ شاہنامہ لکھیں مگر بیدؔل نے برابر انکار کیا۔ جب بہت مجبور کیا تو کہلا بھیجا کہ میں بادشاہ سے جنگ کرنا نہیں چاہتا۔ زیادہ تنگ کیا جاؤں گا تو ملک خدا تنگ نہیں کہیں باہر چلا جاؤں گا۔

ایک امیر نے زر نقد تحفۃً دینا چاہا۔ بیدؔل نے یہ کہہ کر لینے سے اجتناب کیا کہ میرا ایک غریب کا گھر ہے وہاں اس رقم خطیر کی حفاظت ناممکن ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ عطیہ اپنے ہی پاس رکھیں تاکہ محفوظ رہے بوقت ضرورت دیکھا جائے گا۔ یہ استغنا اور فراغ خاطری بیدل کا جزو مزاج تھی۔ جن سے ان کے خاص روابط تھے انہیں سے تحفے قبول کرتے تھے۔ شکر اللہ خاں نے ایک حویلی ۵۰۰۰ روپے میں خرید کر کے ان کے رہنے کیلئے حوالے کی اور یومیہ دو روپیہ ان کا روزینہ مقرر کیا۔ بیدؔل کا مرتبہ وہی تھا کہ:

اے ہمایش فقیری سلطنت کیا مال ہے　　بادشا آتے ہیں پابوس گدا کے واسطے

بیدؔل، غالبؔ، اقباؔل

ولی را ولی می شناسد' پرانی مثل ہے آج یہ کہا جائے کہ دانشور ہی دانشور کو پہچانتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ آپ تینوں شعرائے مذکورہ کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ اس بات کی غمازی کرے گا کہ تینوں کا سرچشمۂ شاعری ایک ہے، ایک ہی میخانۂ فکر کے جرعہ نوش ہیں۔ حسن فکر [illegible] ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ آیئے پہلے بیدؔل اور غالبؔ سے ملاقات کریں پھر بیدؔل اور اقباؔل [illegible]

بیدؔل اور غالبؔ:۔ غالبؔ نے بیدؔل کو محیط [illegible] ساحل کہا ہے اور قلزم فیض بھی۔ اس نے بہار ایجادی بیدؔل کا شیدائی بن کر اپنی شاعری کے گل بوٹے کھلا[illegible]۔ غالبؔ پر بیدلیت چھائی ہوئی ہے۔ اور اس کا برملا اقرار بھی ہے:

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے　　مجھے رنگ [illegible] بہار ایجادی بیدل پسند آیا

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالبؔ ساز پر رشتے پہ نغمۂ بیدلؔ باندھا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدلؔ کا

آہنگِ سخن میں نہیں جز نغمۂ بیدلؔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

بیدلؔ کے ساتھ غالب کا یہ اعتقاد دیکھیے:

گر ملے حضرت بیدلؔ کا خطِ لوحِ مزار اسدؔ آئینۂ پردازِ معانی مانگے

یہ تو عقیدت اور اعتراف کی باتیں ہوئیں۔ غالب کا طرزِ کلام بھی دیکھیے:۔

نفس با صور دمساز است امروز خموشی محشرِ راز است امروز

رگِ سنگم شرارے می نویسم کفِ خاکم غبارے می نویسم

شکایت گونہ ای دارم ز احباب کتانِ خویشم می شویم بہ مہتاب

یہ تو مثنوی کا رنگ ہوا۔ غزل کا ایک شعر سنیے:

خطے بر ہستیِ عالم کشیدیم از مژہ بستن زخود رفتیم و ہم با خویشتن بردیم دنیا را

آپ نے دیکھا؟ معلوم ہوتا ہے کہ بیدلؔ کا قلم غالبؔ کے ہاتھ میں آگیا ہے اور بیدلؔ کی زبان غالب کے دہن میں

خیالات کی یکسانی کا جائزہ لیا جائے تو اس کے لیے دفتر درکار ہے۔ دونوں کے متحد الخیال

اشعار کا جائزہ لیجیے:

غالبؔ : سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بیدلؔ : خلقے بہ عدم دود و دل و داغِ جگر بُرد خاکِ ہمہ صرفِ گل و سنبل شدہ باشد

غ : آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

ب : در جستجوے ما نہ کشی زحمتِ سراغ جائے رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

غ : مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ب : مطلبم از مے پرستی تر دماغیہا نہ بود یک دو ساغر آب دارد گریۂ مستانہ را

غ : وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کیلئے

ب : ننگِ زخلق پردہ بر انگنی چو خضر مردنا بہ از خجالتِ بسیار زیستن

غ : دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ب : ہر کجا می گزری گرد پر طاؤس است ‌ نقش پایت چہ قدر بوقلموں می گردد

غ : قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ‌ ہم کو منظور تنک ظرفی منصور نہیں

ب : من و ساز دکانِ خود فروشی چہ حرف است ایں ‌ جنون این فضولی در سر منصوری باشد

غ : تا کجا ایں جلوہ زاں کافر ادا می خواستم ‌ کز ہجوم شوق در وصل انتظارے داشتم

ب : محو یاریم و آرزو باقی ست ‌ وصل ما انتظار را ماند

غ : دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو ‌ کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

ب : طریق عشق دشوار است آئین خرد بگزر ‌ حریف کفر اگر نتواں شدن ناچار مسلماں شو

غ : ما بہ ہمیں خودیم اما خود از وہم دوئی ‌ درمیان ما و غالب ما و غالب حائل است

ب : لب فرو بندیم تا رنج دوئی انشا کنیم ‌ درمیان ما و تو ما و تو حائل می شود

بیدلؔ اور اقبالؔ :۔ اقبالؔ غالبؔ کے وسیلے سے بیدلؔ تک پہنچے۔ بیدلؔ کو اقبالؔ مرشد کامل کہتے تھے اور مفکر سمجھتے تھے۔ بیدل کے متعلق ان کی رائے یہ ہے کہ وہ اپنی طرز کا موجد بھی تھا اور خاتم بھی۔ اقبالؔ کا یہ قول بھی تھا کہ دنیا میں چار اشخاص ایسے ہیں جن کے طلسم میں جو شخص گرفتار ہو گیا تو مشکل سے رہائی پا سکتا ہے۔ وہ چار زن یہ ہیں :۔ محی الدین ابن عربی، شنکر اچاریہ، بیدل اور ہیگل۔

اقبالؔ بھی بیدلؔ سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔ مسئلہ خودی و بیخودی، زمان و مکان، وجود و عدم، درس عمل، عظمت انسانی سے متعلق اقبال کے جو خیالات ہیں ان پر بیدل کا عکس نمایاں ہے۔ ان کے بہترے اشعار مطالب و مفہوم میں بیدلؔ سے ہم آہنگ ہیں اور کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساز ایک ہی ہے آواز مختلف ہے۔ اور کہیں یہ بھی ہے کہ ساز اور آواز دونوں میں ہم آہنگی ہے۔ اقبالؔ کا مشہور شعر ہے :

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل ‌ لیکن کبھی کبھی [illegible] بھی چھوڑ دیے

اس شعر کا سرچشمہ بیدلؔ ہی کا شعر ہے :

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است ‌ ہر چند عقل کل شدہ [illegible] بے جنوں مباش

عظمت انسانی کا اظہار اقبالؔ نے یوں کیا ہے :

آئینہ کائنات کا معنی دیریاب تو ‌ نکلے تری تلاش میں [illegible] رنگ و بو

مگر ذرا بیدلؔ کے انداز بیان کو تو دیکھیے کہ کس شاعرانہ لب و لہجہ میں [illegible] پکار پکار کر انسان کو چونکایا ہے :

اپنی ذات میں محویت کا عالم اقبالؔ نے اس طرح دکھلایا ہے:

نظر بہ خویش چناں بستہ ام جلوۂ دوست   جہاں گرفت و مرا فرصت تماشا نیست

اور بیدلؔ کی محویت کا عالم دیکھیے:

کار ما با غیرتِ عشق غیور افتادہ است   شش جہت دیدار و ما را از گریباں پا بست

اقبالؔ اور بیدلؔ کی ہم آہنگی

اقبال: ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز   چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

بیدل: ملت اللہ از خلق ابراہیم و حنیف فطرت است   زین سبب با بولہب خشم پیمبر بودہ است

اقبال: مرا ایں خاکدانِ من ز فردوس بریں خوشتر   مقام ذوق و شوق است و حریم سوز و ساز ایں

بیدل: گویند بہشت است ہمہ راحت جاوید   جائے کہ بداغے نہ طپید دل چہ مقام است

اقبال: پرتو حسن تو می افتد بروں مانند رنگ   صورت مے پردہ از دیوار مینا ساختی

بیدل: دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن   رنگ مے بیروں نشست از بس کہ مینا تنگ بود

اقبال: ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے   بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بیدل: دمیدہ است چو نرگس دریں تماشا گاہ   ہزار چشم و یکی را نصیب دیدن نیست

اقبال: حسن کا گنج گراں مایہ تجھے مل جاتا   تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

بیدل: بروں ز دل نتواں یافت ہر چہ خواہی یافت   کدام گنج کہ در خانۂ خراب تو نیست

اقبال: زاہد کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد   دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

بیدل: حرص ما ہر سو می برد بر سیم و زر دارد نگاہ   زاہد از فردوس ہم مطلوب جز دنیا نداشت

اقبال: سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں   ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

بیدل: آنچہ ندارد دوام نیست بغیر از تلف   آنچہ نہ بندد ثبات نیست بجز انقلاب

اقبال: موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت   ہستم اگر می روم گر نروم نیستم

بیدل: موج دریا را بہ ساحل ہم نشینی صحت است   بے قراراں بند منزل کردہ اند آرام را

اقبالؔ نے اسی خیال کو یوں کہا ہے:

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول   لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو ساحل نہ کر قبول

موضوعات کلام

تلاش حقیقت :

بحر بیتاب کہ آں گوہر نایاب کجاست   چرخ سرگشتہ کہ خورشید جہانتاب کجاست
دیر ازیں غصہ در آتش کہ چہ سنگ است صنم   کعبہ زیں درد سیہ پوش کہ محراب کجاست

ناکامی کیوں ؟

موج دریا در کنارم از تگ و پویم مپرس   آنچہ من گم کردہ ام تا یافتن گم کردہ ام

قناعت :

دنیا اگر دہند نہ جنبم ز جائے خویش   من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

انعام واکرام سے بیزاری :

قبول انعام بز معاشاں بخود گوارا مگیر بیدل   کہ می شود ایں گلو فراخاں چو استخواں ز نوالہ پیدا

شوق ہی صنم ہے :

بیدل من و بیکاری و معشوق تراشی   جز شوق برہمن صنمے نیست دریں جا

سکون کہاں ؟

مردہ ہم فکر قیامت دارد   آرمیدن چہ قدر دشوار است

مجاز حقیقت نہیں ہے :

نیامد است شرابے بہ عرض شوخی رنگ   جہاں ہنوز رہیست از رگ تاک است

کچھ تو کرو :

یوسفی کن اگر اسباب مسیحائی نیست   بہ فلک گر [illegible]سیدی بن چاہے دریاب

انسان اب تک ایک راز ہے :

ذرہ تا مہر ہزار آئینہ عریاں کردند   ما نگشتیم [illegible] ہر چہ نمایاں کردند

زندہ رہنا ہے جیسے بھی ہو :

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست   شاد باید زیستن [illegible] ناشاد باید زیستن

انتہائے نافہمی:

بیدل آں گوہر نایاب سراغ — بہ محیطیت کہ پرسیدن نیست
عکس افتادہ در آئینہ ہوش — گل تواں گفت ولے چیدن نیست
نسخہ ہا در بغل و فہم محال — جلوہ ہا در نظر و دیدن نیست

فلسفۂ ارتقا:

ہیچ شکلے بے ہیولیٰ قابل صورت نہ شد — آدمی ہم پیش ازاں کآدم بود بوزینہ بود

مقصد ہستی:

مطلبے گر بود از ہستی ہمیں آزار بود — ورنہ در کنج عدم آسودگی بسیار بود

نظریۂ زماں:

در طلسم عجز فرصت حال و استقبال کو — شش جہت یک گردش رنگ است ماہ و سال کو

معشوق کی نیم نگاہی:

چشم تو بہ حال من گر نیم نظر خندد — خارم بہ چمن نازد عیبم بہ ہنر خندد

معشوق کی غلط نگاہی:

مگر نہ چشمش غلط نگاہے رسد بہ فریاد حال بیدل — وگر نہ آں برق بے نیازی پے گیاہ کے می خرامد؟

تصوف بیکاروں کا مشغلہ ہے

در مزاج خلق بیکاری ہوس می پرورد — غافلاں نام فضولی را تصوف کردہ اند

دل کی تنگی:

دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن — رنگ مے بیروں نشست از بس کہ مینا تنگ بود

کس سے کہیے:

با کہ باید گفت بیدل ماجرائے آرزو — آنچہ دل خواہ من است از عالم ادراک نیست

دنیا شیشہ گر کی دکان ہے:

بیدل از کلفت شکست منال — بزم ہستی دکان شیشہ گر است

کہاں سے میں کہاں لایا گیا ہوں:

کہ کشیدہ دامن فطرتت کہ بہ سیر ما و من آمدی   تو بہار عالم دیگری کجا بایں چمن آمدی

طواف خویش:

مست عرفاں از شراب دیگرے درکار نیست   جز طواف خویش دور ساغرے درکار نیست

رضا میں نالہ کیسا؟

بہ محفلے کہ دل آئینہ رضا طلبی است   نفس درازی فریاد ہائے بے ادبی است

حسن مطلق چھپانے سے کہیں چھپتا ہے:

ہر جا بروں پوشیدہ ای خود را بخود پوشیدہ ای   در نور شمعت مضمحل فانوس پیراہنت

عظمت خرد:

آدمی زادہ وارث خرد است   بے خرد غیر نسل حیواں نیست
ہر کجا عقل کردہ است ظہور   مظہرش جز وجود انسان نیست

حسن بیان اور قدرت تشبیہ:

سزد کہ چشم ہوس از گل و سمن پوشیم   سرے کشیم و دریں گوشۂ چمن پوشیم

عشق غیور:

کار ما با غیرت عشق غیور افتادہ است   ششجہت [illegible] ار و ما را از گریباں چارہ نیست

گریہ کی بے اثری:

علاج زخم دل از گریہ کے ممکن بود بیدل   بہ شبنم بخیہ نتواں کرد چاک دامن گل را

ناکامی پر افسوس:

بہ شبنمے ہمہ ایں گلستاں نشانہ پیش نبازد دل   عرق چو [illegible] زمیں رفت و ما کدیم کا شود را

حسن الفاظ و معانی:

تمام شوخیم لیک غافل کہ دل بہ نگاہ می خرامد   جگہ ہائے [illegible] تختی بآئے کہ می خرامد

صفات سے ذات کی طرف:

پے تماشہ اے دیدہ پو پسند ہمت جستجو   بہ خیال [illegible] او گر بے شور و شغف در آ

همہ غیب است ظہور اینجا نیست　　جملہ انفاس است نمود اینجا نیست

نتواں جلوہ مطلق دیدن　　آنکہ ایں پردہ کشود اینجا نیست

بیدلؔ آں شعلہ کز و بزم چراغاں گرم است　　یک حقیقت بہزار آئینہ تاباں شدہ است

بیدلؔ کی شاعری کا پس منظر اس کا یہی شعر ہے۔ اسی آئینہ خانہ میں بیدلؔ حیرت زدہ کھڑا ہے۔ اس کے کلام کا مطالعہ کیجیے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نہ بجھنے والی پیاس ہے۔ ایک نہ ختم ہونے والی تمنا ہے، ایک منزل ناآشنا تجسس ہے جو سارے کلام میں جاری و ساری ہے۔ وہ اپنی ہستی کو ذات مطلق میں گم کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا مسلک تو یہ ہے کہ "تو در آغوشی و من گشتہ از دور دیدن ہا"۔ اس کو آسودگی پسند نہیں۔ ایک اضطراب مسلسل ایک جد و جہد کا جذبہ ہے جو ہر جگہ کارفرما ہے۔ بہشت کی راحت جاوید اس کو کہاں پسند:

گر نہ بہشت است ہماں راحت جاوید　　جائے کہ بداغے نہ طپد دل چہ قیامت

ہنگام وصل میں بھی وہ زحمتِ انتظار کا شیدائی ہے:

محو یاریم و آرزو باقیست　　وصل ما انتظار را ماند

اس کے سارے کلام میں ایک جوش و خروش ہے۔ ایک ولولہ ہے، ایک تڑپ ہے:

ہر غبارے کہ دریں عرصہ طوفاں برخاست　　ہمہ از شوخی دیباکی جولاں برخاست

اس کی نگاہ مطالعہ فطرت کے لئے وا ہے۔ ہر ذرہ اپنی زبان خموشی سے سخن طراز ہے ؎

از زمیں تا بہ آسماں سخن است

اس کے سمجھنے کے لئے چشم بصیرت درکار ہے ؎

چشم وا کردن زمین و آسماں فہمیدن است

بیدلؔ کو سکون پسند نہیں۔ کائنات کی ہر چیز متحرک ہے، سفر میں ہے یہاں تک کہ:

ہر کجا نکہت گل پیرہن رنگ درید　　نیست پوشیدہ کہ از خود سفرے خواہد

اس کے مسلک ہی میں ہے کہ ؎　　عمر آسودگی ما بہ سفری گزرد

غالبؔ نے یہیں سے درس لیا۔ ؎　　زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

اقبالؔ نے یہیں سے یہ سبق پڑھا ؎　　ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

عظمتِ انسانی اقبالؔ کی شاعری کا محور ہے مگر اس کا سرچشمہ بیدلؔ ہی کا کلام ہے:

ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی　　اے بہار نیستی از قدر خود ہشیار باش

بیخودی میں بھی وہ اپنی خودی کو برقرار رکھنا چاہتا ہے ؎

بہ دریا ہم چو گوہر خلوتی در انجمن دارم

خودداری اور شانِ استغنا کی مثال غالبؔ کے یہاں بھی ملتی ہے۔ ؎

الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور اقبالؔ کے یہاں سے گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ　پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

مگر بیدلؔ کس غضب کے انداز میں کہہ گیا ہے:

درہائے فردوس وا بود امروز　　از بے دماغی گفتیم فردا

مختصر یہ کہ بیدلؔ کے کلام میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ اس کے دلی جذبات و مشاہدات کا پرتو ہے اس کی شاعری تمام تر جذباتی ہے محض تخیلی نہیں، اسی لیے بڑی کیفیت ہے۔ بیدلؔ کے مطالعہ کو سمجھنے کے لیے دماغ سے زیادہ دل کی ضرورت ہے۔ غالبؔ نے بھی اس کا رنگ اختیار کرنا چاہا مگر چونکہ وہ اس جذبے سے محروم تھا اس لئے بیدلؔ کے نقشِ قدم پر چلنا اس کے لئے قیامت ہو گیا۔ وہ آگ جو بیدلؔ کے دل میں لگی ہوئی تھی وہ سوز جس سے اس کا دل و جگر برشتہ تھا وہ غالبؔ کے یہاں کہاں؟ اقبالؔ پر بیدلؔ کا پرتو بڑی حد تک پڑا ہے۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ شبلیؔ جیسا ناقد اور خود فارسی کا شاعر بیدلؔ کے کلام کی عظمت سے آگاہ نہ ہو سکا۔ سبھی تذکرہ نگار بیدلؔ کی عظمت کے قائل تو نظر آتے ہیں مگر ان کی روح شاعری تک اب تک بہت کم لوگوں کی رسائی ہوئی ہے،

سہل بیدل کا ہے سمجھنا کیا؟　　ہر سخن اس کا ایک مقام سے ہے

میرؔ نے اپنے متعلق کہا تھا کہ:

جہاں سے دیکھیے اک شعر شور انگیز نکلے ہے　　قیامت کا [illegible] ہے ہر جا میرے دیوان میں

مگر یہ حرف بہ حرف صادق آتا ہے بیدلؔ کے کلام پر۔

شاعری اور موسیقی

شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نظم [illegible] اور آہنگ کا جو ربط و ضبط ہوتا ہے

اس کی اثر آفرینی اکثر ساحرانہ رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ بیدل کو عموماً ایسی بحریں پسند ہیں جن میں صوتی توازن کارفرما ہوتا ہے۔ الفاظ کا دروبست ترکیبات کی ہم آہنگی سے ترنم کی ایک ایسی فضا تیار ہو جاتی ہے جو وجد آفریں ہے۔ طویل بحروں میں بیدل کو بحر کامل سالم مثمن بہ غایت پسند ہے جس کا وزن ہے متفاعلن ۸ بار۔ کلیات کے مطالعہ سے اس بحر میں سو سے بھی زیادہ غزلیں ملینگی۔ چند کے مطلعے سنیئے:

۱۔ ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما — چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بکنار ما

۲۔ ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ — تو ز غنچہ کم ندمیدہ ای در دل کشا بہ چمن درآ

۳۔ بہ خیال چشم کہ می زند قدح جنوں دل تنگ ما — کہ ہزار میکدہ می دود بہ رکاب گردش رنگ ما

۴۔ بہ نمود ہستی بے خبر چہ نقاب شق کنم از حیا — تو مگر بہ من نظرے کنی کہ نہ ے عرق کنم از حیا

۵۔ کہ کشید دامن فطرت کہ بہ سیر ما و من آمدی — تو بہار عالم دیگری ز کجا بہ این چمن آمدی

۶۔ سر طرۂ بہ ہوا فشاں فتنی بہ مشک تر آفریں — مژہ برآمنہ باز کن گل عالم دگر آفریں

۷۔ تو کریم مطلق و من گدا چہ کنی جز ایں کہ نخوانیم — در دیگرے بنما کہ من بکجا روم چو برانیم

دوسری بحر جو بیدل کو زیادہ پسند ہے وہ بحر متقارب مثمن غیر سالم ہے۔ جس کا وزن ہے مفعول فعلن، ۸ بار۔ مثلاً

۱۔ تمام شوقیم لیک غافل کہ دل براہ کہ می خرامد — جگر بداغ کہ می تپید نفس بآہ کہ می خرامد

۲۔ اگر بگلشن ز ناز گردد قد بلند تو جلوہ فرما — ز بیکسی سرو موج خجلت شود نمایاں چو مے ز مینا

بحر رجز بھی جس کا وزن مستفعلن ہے ۸ بار بیدل کی طبیعت کے موافق ہے

۱۔ اے پرفشاں چوں بوئے گل بیرنگی از پیراہنت — عنقا شدم تا گردِ من یابد سراغ دامنت

ایسی طویل بحروں میں صوتی آہنگ کا التزام اور حشو و زوائد سے کلام کو پاک رکھنا بیدل ہی کے قلم کا اعجاز ہے۔

مشکل پسندی کے ساتھ سہل پسندی

بیدل مشکل پسندی کے لئے بدنام ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے اشعار کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ یہ بھی اس کا ایک اعجاز ہے کہ اس کے اشعار سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں دل کو مکیف کرتے ہیں اور انسان طلسم الفاظ میں گم ہو کر وجد کرنے لگتا ہے۔

بیدلؔ کے کلام کو سمجھنے کے لئے اس کی زندگی کے احوال پر پوری واقفیت کی ضرورت ہے اس کی نثری تصانیف کو پڑھے بغیر اس کے افکار و مشاہدات سے کما حقہٗ آگاہی نہیں ہو سکتی۔ خیالات کا سراغ لگ جائے تو معنی کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ بہر کیف وہ مشکل سے مشکل اشعار کے ساتھ ساتھ نہایت سادہ اور عام فہم انداز میں بھی خیالات کے ادا کرنے کی قدرت کاملہ رکھتا ہے۔ چند اشعار سنئے:

برائے خاطرم غم آفریدند　　طفیلِ چشمِ من تا نم آفریدند

بختِ من زلفِ یار را ماند　　وضعِ من روزگار را ماند

چو محوِ عشق شدی رہنما چہ می جوئی　　بہ بحر غوطہ زدی ناخدا چہ می جوئی

بر امیدِ وصل مشکل نیست قطعِ زندگی　　شوقِ منزل می کند نزدیک راہِ دور را

درہائے فردوس وا بود امروز　　از بے دماغی گفتیم - فردا

مردہ غم فکرِ قیامت دارد　　آرمیدن چہ قدر دشوار است

خیالِ زندگی درد است بیدلؔ　　کہ غیر از مرگ درمانے ندارد

زندگی در گردنم افتاد بیدلؔ چارہ نیست　　شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

یہ تین اشعار اتنے مقبول ہوئے کہ اورنگ زیب نے اپنے رقعات میں ان کو نقل کیا ہے:

من نمی گویم زیاں کن یا بہ فکرِ سود باش　　اے ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن　　اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسبابِ جہاں　　آنچہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست

اس سے بڑھ کر بیدلؔ کی مقبولیت کا ثبوت اور کیا ہوگا کہ بادشاہِ وقت نے اس کے اشعار کی پذیرائی کی۔

چند لطیفے

۱۔ ایک بار جعفر زٹلی بیدلؔ کے پاس پہنچے۔ جعفر کا معمول تھا کہ جہاں جاتے اس کی شان میں کچھ مدح پڑھتے کچھ صلہ ملا تو خیر ورنہ ہجو بھی کہہ کر لے جاتے۔ بیدلؔ کے پاس پہنچے تو ان کی تعریف میں یہ کہا۔ ع

چہ عرفی چہ فیضی بہ پیشِ تو ہیچ

بیدلؔ بہت بددل ہوئے اور کہا حضرت یہ مناسب نہیں آپ نے مہربانی کی تشریف لائے پھر دو اشرفیاں ان کی نذر کیں کہ چلتے بنئے۔ لوگوں نے کہا کہ حضور اس کا دوسرا مصرع بھی کم از کم سن لیں کہ بھنش کا قافیہ کیا لکھا ہے مگر مسموع نہ ہوا۔

۲۔ ایک منصبدار جو سخت مزاج تھے اور ایک حد تک بدنام تھے، بیدلؔ سے واقف تو تھے مگر پہچانتے نہ تھے۔ ایک دن بیدل کو دیکھا پوچھا کہ کون ہیں معلوم ہوا کہ بیدلؔ ہیں۔ ان کو تعجب ہوا کہ بیدلؔ اتنا برگزیدہ اور کامل فقیر، اور داڑھی مونچھ ندارد معترض ہوئے۔ بیدلؔ نے برجستہ کہا:

ریش و بروت خویش تراشیدہ ایم ما   اما دل کسے نہ خراشیدہ ایم ما

یہ شعر سن کر وہ منصب دار بڑا خفیف ہوا۔

ایک روایت اور اس کی حقیقت

بیدلؔ نے شاہجہاں کا پر امن دور بھی دیکھا۔ اور عالمگیر کی سطوت و جبروت کا بھی نظارہ کیا۔ پھر شاہزادوں کے باہمی جنگ و جدال اور خون کے دریا میں ان کو ڈوبتے اور ابھرتے بھی دیکھا۔ ملک کی اخلاقی قدروں کو مٹتے ہوئے دیکھا، طوایف الملوکی کا نظارہ بھی کیا۔ ان سب کا اثر ان کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔ شاہجہاں کا پر درد مرثیہ لکھا۔ شہر آشوب میں جہاندار شاہ کے عہد حکومت کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ حد درجہ شرمناک بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔

سادات بارہ سے جن کو بادشاہ گر کہا جاتا ہے بیدل کے مخلصانہ تعلقات تھے وہ بیدلؔ کی عظمت کرتے تھے۔ مگر جب انہوں نے فرخ سیر کو بڑی بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا تو بیدل کے جذبات کو بڑی ٹھیس لگی اور کہا جاتا ہے کہ ایک رباعی بیدلؔ نے اس موقع پر لکھی:

دیدی کہ چہ باشاہ گرامی کردند   صد جور و جفا زراہِ خامی کردند

تاریخ چو از خرد بجستم فرمود   سادات بوے نمک حرامی کردند   ۱۱۳۱ھ

سادات بارہہ کے خلاف ایسا کہنا گویا موت کو دعوت دینا تھا چونکہ مشہور ہوا کہ یہ رباعی زائیدہ فکر بیدلؔ ہے اس لئے بیدلؔ نے عافیت اسی میں سمجھی کہ دہلی چھوڑ کر لاہور میں جا کر پناہ لی۔ اس رباعی کا جواب بے خبر نے یوں دیا:

باشاہ سقیم انچہ شاید کردند   از دست حکیم ہر چہ آید کردند

بقراط خرد نسخہ تاریخ نوشت — سادات ودانش آنچہ باید کردند

ادھر محمد شاہ سے سید برادران کی ان بن ہو گئی۔ بالآخر یہ دونوں بھائی صفحۂ اقتدار سے مٹ گئے۔ پھر بیدلؔ واپس آئے، بیمار پڑے اور ۴ صفر ۱۱۳۳ھ کو سفر آخرت اختیار کیا۔

کلام بیدلؔ پر نکتہ چینی

بیدلؔ کے کلام کو لوگوں نے بھاری پتھر سمجھا اور چوم کر چھوڑ دیا۔ ان کی عظمت تو پہچانی مگر ان کے کلام کی عظمت سے آگاہی حاصل نہ کر سکے بلکہ ان کی جدت طرازی پر نکتہ چینی کی۔ ان کو مخاطب کر کے بیدلؔ کہتا ہے:

بیدل در نسخۂ رموز اشعار — عیبم مکنی بہ نکتہ ہای بیکار
ہشدار کہ در نظم وجود انساں — چون ناخن وموست عضوی بسیار

عیوب کس کے کلام میں نہیں۔ کلام کی خوبیوں کو تو دیکھو:

مگو این نسخہ طرز معنی یکدست کم دارد — تو خارج نغمہ ای ساز سخن صد زیر و بم دارد
تمیز خوب وزشتم سوخت ذوق سرخوشی بالک — زصاف و درد مخمور آنچہ باید مغتنم دارد

بیدلؔ نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ شاعری کھیل نہیں ہے۔ اس میں بڑی کدوکاوش کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب تک اس میں ساری عمر نہ کھپائی جائے عیوب شاعری سے بچنا محال ہے کون ہے جس کا کلام نکتہ چینی سے بچا ہوا ہے۔ یہ کلام انسانی ہے کلام ربانی نہیں جس میں غلطی نہ ہو:

تا کس یک عمر نشتر کہ نخورد — مشکل کہ بیانش لطمہ رد نخورد
از عالم آیات زبور است این جا — آں نغمہ کہ بر گوش کسی بد نخورد

داغؔ نے بھی یہی کہا ہے:

مجھے یہ ڈر ہے کہ ایمان نے نہ آئیں لوگ — خدا کرے غلطی [illegible] سخن میں ہے

حقیقت یہ ہے کہ بیدلؔ نے اپنے خیالات کو ادا کرنے کے لیے رنگ [illegible] تشبیہات واستعارات سے کام لیا ہے۔ اختراع تراکیب وابداع اسلوب کا سہارا لینا اس کی فطرت [illegible] بھی تھا اور ادائے مطالب کے لیے ناگزیر بھی۔

یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ مختلف فنون کے اظہار کے لئے اسلوب بیان اور طرز ادا بھی مختلف ہونا لازمی ہے۔ فلسفۂ الٰہیات و مابعد الطبیعات کے مسائل کو آپ بہشتی زیور یا مراۃ العروس کی زبان میں ادا نہیں کر سکتے۔ بیدل کا کلام ایک دوسرے ہی عالم میں ہمیں پہنچا دیتا ہے۔ جب خیالات بلند ہونگے تو ان کے اظہار کے لئے پیرایۂ بیان بھی ویسا ہی بلند ہوگا۔ ان کے لئے نت نئی ترکیبیں بھی اختراع کرنا ہونگی مگر قدامت پسندی اس بات کی مقتضی ہے کہ پیش رووں کے کلام سے سند بھی ملے۔ ایرانی اہل زبان عمومی طور پر غیر ایرانی کے کلام کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے مگر یہ نہیں دیکھتے کہ انہی غیر ایرانیوں نے فارسی زبان کی خدمت ان سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں کی ہے۔

خوشگو نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ اول تو بیدل کی زبان پر اعتراضات غیر واجب ہیں پھر بھی مان لیا جائے کہ ان کی جدت کانوں کو غیر مستحسن نظر آتی ہے تو آپ ان کے ان اشعار کو نظر انداز کر کے دیکھیے کتنے ہونگے سو، دو سو، ہزار، دو ہزار مان لیا کہ دس ہزار تو بقیہ نوے ہزار اشعار پر تو ایمان لانا ہی پڑے گا۔ خود بیدل اپنی لغزش کی کیا خوبصورت تعبیر کرتا ہے:

می گزارد بر دماغ یک جہاں معنی قدم　　لغزشے کز خامۂ تحریر من پیدا شود

بیدل کو خود احساس تھا کہ اس کے اشعار کے مطالب ہر کس و ناکس کی فہم سے پرے ہیں جن کی سمجھ میں نہیں آتا وہ اور کام کریں۔ دنیا میں بہت سے کام کرنے کے ہیں:

تو کار خویش کن اینجا توئی درمن نمی گنجد　　گریباں عالمے دارد کہ در دامن نمی گنجد

مرثیہ فرزند

بڑھاپے میں لڑکا پیدا ہوا وہ بھی چار سال میں اللہ کو پیارا ہوگیا۔ اس کا مرثیہ لکھا:

ہیہات چہ برق پرفشاں رفت　　کاشوب قیامتم بہ جاں رفت
گرتا بے بود در توان رفت　　طفلم زیں کہنہ خاکداں رفت
بازی بازی بر آسماں رفت
ہر گہ دو قدم خرام می کاشت　　از انگشتم عصا بکف داشت
یارب چہ علم بہ دستش افراشت　　دست از دو ستم چگونہ برداشت
بے من بہ رہ عدم چساں رفت

خرام کا شتن پر اعتراض ہوا۔ یہ بڑی نادر اور اچھوتی تشبیہ ہے۔

اسی طرح ایک شخص نے ازراہ طنز بیدلؔ سے کہا کہ آپ کے شعر میں بڑی جدّت ہے۔ یعنی یہ اوروں نے یہ نہیں لکھا۔ سند چاہیئے۔ شعر کا مفہوم یہ تھا کہ سے "زموئے کاسۂ چینی نمد نمی بافند" بیدلؔ سمجھ گئے کہ اعتراض ہے۔ شعرائے پیشین سے سترہ شعرا کے کلام سے زبانی اشعار سنا کر سند پیش کی۔ اگر سند نہ بھی ہوتی تو خود بیدل کا کلام سند ہوتا۔

کلیات بیدلؔ کی اشاعتیں

بیدلؔ کے کلیات کے قلمی نسخے بے شمار ہیں خود بیدلؔ نے اپنی زندگی میں اپنا مکمل کلام چیز عربی لکھوا کر اور اس کے وزن کے برابر زر نقد خیرات کئے تھے کہ یہ فرزند معنوی تھا۔ یہی دیوان ان کے مزار پر عرس کے موقع پر رکھا رہتا تھا۔

بیدلؔ کے انتقال کے ۱۴۵ سال بعد سب سے پہلے مطبع احمدی دہلی سے کلیات بیدلؔ دو جلدوں میں شائع ہوا۔ اس کی پہلی جلد خدا بخش میں اور دوسری میرے پاس تھی۔ اس کے بعد نولکشور سے ۱۲۹۲ھ میں اور مطبع صفدری سے ۱۲۹۹ھ میں کلیات شائع ہوئے۔ کابل سے کلیات کی مکمل اشاعت ۴ جلدوں میں ۱۳۴۱ھ میں ہوئی۔ یہ وزنی کلیات ٹائپ میں ہے اور زیادہ صحیح ہے۔ وزن اتنا کہ ایک آدمی بیک وقت مشکل سے اٹھا سکے۔ اس کا نسخہ خدا بخش میں موجود ہے۔ ایران سے اس کا کوئی نسخہ شائع نہیں ہوا۔

••

شام غریباں کے توسط سے مرآت واردات سے بیدل کے احوال پر نئی روشنی

میرزا بیدل مشار الیہ از واردان ہند نیست. وجہ ایراد او درین تالیف این کہ تذکرہ نویسان احوال میرزا را تفصیلاً
واجمالاً نوشتہ اند و محرر اوراق ہم در تذکرہ «گل رعنا» احوال میرزا را مستوفی نوشتہ. درین ایام «مرآت واردات» تالیف
شاہ محمد شفیع متخلص بہ وارد تہرانی بنظر رسیدہ، درین کتاب بعضی احوال میرزا سوای آن است کہ در تذکرہ ہا بنظر رسیدہ
و تالیف شاہ وارد غیر مشہور است. لہذا بخاطر رسید کہ میرزا صاحب کمال عمدہ است، ترجمہ او را با احوال زاید کہ شاہ وارد
آوردہ باید نوشت تا بر صفحۂ روزگار باقی ماند. شاہ وارد می نویسد: طایر خوش نوای وجود میرزا از گلستان عدم در اکبرنگر عرف
راج محل از ممالک بنگالہ بہ پرواز گشود و مدتے دران سرزمین معاش بجمعیت بسر بردہ و در کمال جوانی رو بہ ہندوستان آوردہ و
نخست در صحبت میرزا اسلیمان خالوی حقیقی سلطان محمد معز الدین خلف شاہ عالم بن عالمگیر سالہا بسر بردہ. بعد فوت میرزا سلطان در سلک
نوازمان اعظم شاہ بن عالمگیر منسلک گشتہ، بیت الغزل دیوان اعتبار گردید. روزے یکے از مقربان بساط سلطنت اشعار میرزا بہ سمع شاہ
رسانید. شاہ پرسید این اشعار کیست، عرض کرد کہ از میرزا بیدل. شاہ بر سبیل خوش طبعی فرمود: بیدل را در لشکر ما کہ تمام ہمراہان بیدل اند
چہ کار. میرزا بمجرد استماع این فحوای خارج آہنگ از ان مقام قدم براہ سفر گذاشت. پس از قطع منازل در بلدۂ متھرا بر
کنار دریای جمن اقامت گزید. لعل محمد نامی حاکم آن مکان نایب حسن علی خان بہادر [illegible] از قدوم میرزا اطلاع یافتہ در دلجوئی
و خاطرداری کوشید. میرزا نیز دلدادۂ صحبت او شد. اتفاقاً سلطان عالمگیر کہ در دکن بود لعل محمد را بحضور خود طلبید. لعل محمد موجب حکم
پادشاہ میرزا را ہمراہ بر راہ سفر دکن آوردہ و در عرض راہ سمند عزیمت بصوب اقلیم عدم جلوریز ساخت. میرزا تا مدت یک و نیم سال در خانۂ
راقم این اوراق بے تشویش معاش رحل اقامت افگند تا آنکہ قاصد شکر اللہ خان کہ دران ایام بہ حکومت بلدۂ نارنول الحال میوات می
پرداخت پیش میرزا رسیدہ مکتوب اشتیاق مع نذرے رسانید. میرزا از دوستی چنین اتفاق روانۂ بلدۂ مذکورہ نمودہ روزے [illegible] بصوب [illegible]
[illegible] بہ خیال مفارقت [illegible]
[illegible] شکر اللہ خان مخاطب گشت و میانی شاکر خان و [illegible] میر کرم اللہ خان عاشق تخلص کہ آخر کار بخطاب [illegible] خانی رسیدہ
[illegible] مراتب دلجوئی [illegible] کوشیدند کہ میرزا عمر طویل زندگانی را تا ہنگام سکتۂ مرگ بدولت جمعیت خاطر گزرانید. در باب
نسب خویش آنچہ میرزا در حضور این احقر العباد مکرر تقریر کرد این است کہ سلسلۂ اجداد میرزا منتہی بہ شاہ منصور بن مظفر پادشاہ فارس
[illegible] کہ خواجہ حافظ شیرازی می گوید [illegible] ہنگامیکہ شاہ منصور با امیر تیمور صف آرائی نمودہ کشتہ گردید اولاد او [illegible] بصوب [illegible]
آوردند. چند پشت میرزا [illegible] اقامت داشتند. بزرگوار میرزا از ان مکان مفارقت ورزیدہ در ملک بنگالہ رحل اقامت
افگند. بعد انقضای یک پشت [illegible] وجود میرزا از مطلع [illegible] سعادت طالع گشت. میرزا بہ پیرایۂ اہلیت آراستہ [illegible] صاحب کمالی

نگردد و مدام بجمعیت معاش با کمال انتعاش اوقات عزیزه بسر برده و امیران عظام و صاحب ثروتان عالی احترام با ادب تمام و اشتیاق ملاکلام

فیض اندوز مجلس خاص می گشتند. میرزا در مدت العمر سوای خانهٔ شکرالله خان و فرزندانش کمتر بخانه دیگر رفته، او ولادت و اعیان عصر قدم فرسا می گردید.

سن شریف میرزا بهشتاد رسیده و رحلت میرزا از این خاکدان فنا بسوی دار الصفاء بقا روز پنجشنبه چهارم صفر سنه یک هزار و یکصد و سی

واقع شد." تا اینجا خلاصهٔ کلام شاه وارد از "مرآت واردات" است. و نیز شاه وارد گوید "در بحر کامل چهار رو چهار اول شاعرے شعر

موزون کرد ادیب صابر است و او غزلے پیش از هفت بیت مرقوم قلم نساخته. مطلعش این است :

چنین شنیده ام که لطف یزدان بر روے مو بنده دره بندد درے که بگشاید از حقیقت بر اهل عرفان دگر نه بندد

و بعد از ادیب صابر مولانا عبدالرحمن جامی غزل هفده بیت ایجاد شود و میرزا بیدل در بحر کامل چهار رو چهار رباعیات مشمول به مضامین

خاص و مضامین عالی تصنیف کرده." انتهی کلامه. ملخصاً میر آزاد فرموده شاه وارد خبر ندارد که مطلعے که از ادیب صابر نقل کرده در بحر کامل

نیست بلکه از فروغ بحر متقارب است. تقطیعش فعولن فعل هشت بار در خانه آن بیر شانزده رکن باشد و بحر کامل متفاعلن هشت بار است

و نیز عرض می شود که میرزا بیدل بانی نظم در بحر کامل نیست. چنانچه مردم ناواقف اعتقاد دارند. امیر حسن دهلوی چهارصد سال پیش از میرزا گوید:

مثنی چه باشد اگر شبے سوے دوستان گذرے کنی بمراد ما نفسے زنی بنیاز ما نظرے کنی

شب من نه گرد سیه تیره شد خو فتم ز مه ایت که نقاب را فگنی ز رخ شب تیره را سحرے کنی

چه غم است زیرا مرضم اگر بعیادتم قدمے نهی چه خوش است این المم اگر بزیارتم گذرے کنی

و سلمان ساوجی از همین زمین می طرازد :

به جنوبه قدد لکشش اگر اے صبا گذرے کنی به صفاے جان حزین من دل خسته را خبرے کنی

این قدر مسلم که میرزا بیدل نظم این بحر را بحد کثرت رسانده، مخفی نماند که شاه وارد مولد میرزا راج محل نوشته و دیگران پٹنه

نوشته اند. چون راج محل قریب پٹنه واقع شده و پٹنه دار الامارة است مولد میرزا پٹنه اشتهار یافته و نیز شاه وارد از زبان میرزا نوشته که

نسبت میرزا بشاه منصور والی فارس می رسد و شیر خان که از شاگردان و معتقدان میرزا است در مرآة الخیال میرزا را از قوم برلاس

بوده اشعار بسیار از میرزا در کل رعنا ثبت افتاده، اینجا چند بیت از "مرآت واردات" نقل کرده می شود :

گر بایں سازست دور از وصل جانان زیستن زنده ام من هم بآن رنگے که نتوان زیستن

خاکم بسر که بے تو به گلشن نه سوختم گل شعله زد ز [illegible] من نه سوختم

تا در کف بستی عنانم دادند از کشمکش جهان [illegible] دادند

چون شمع مقام راستی می جستم زیر قدم خویش [illegible] دادند

ڈاکٹر محمد انصار اللہ
شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پہیلیاں

ہندی کے بدّوانوں اور اردو کے عالموں کے نزدیک یہ بات تقریباً مسلّم ہے کہ پہیلی کہنے کے معاملے میں اولیت کا سہرا امیر خسرو کے سر ہے۔ پروفیسر رام کمار ورما نے لکھا ہے کہ:

"صوفی ادب کے ساتھ مسلمانوں کی لذت کوشی کے اثرات بھی نمایاں ہو کر سامنے آنے لگے۔ امیر خسرو کی مکرنی اور پہیلیوں نے تفریحی ادب پیدا کیا۔ بیر گاتھا کال (بہادری کے قصوں کے دور) کی شام میں تفریح کا یہ سامان قدرتی اور فطری ہوتے ہوئے بھی غیر متوقع تھا کیونکہ خسرو کی پہیلیوں میں نہ تو ادبی متانت تھی اور نہ کسی مخصوص ضابطے کا ان میں سراغ ملتا ہے۔ یہ صرف خیالوں کو گدگدا دینے والی ایک چیز تھی۔ کھانا کھا کر حقہ پیتے وقت یہ تفریح کا ذریعہ ہے۔ اس میں اگر سنگار رس (نشاطیہ انداز) ہے تو وہ بھی غیرت سے خالی اور عریاں۔ کسی قدر ہنسی چاہے آ جائے لیکن زندگی میں ان سے بیداری نہیں آ سکتی۔" (شرکبیر ص ۸۸)

خواجہ امیر خسرو سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں پیدا ہوئے تھے۔ اور انھوں نے سلطان فیروز تغلق کے پہلے سالِ جلوس میں وفات پائی تھی۔ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مسلمان اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے میں مصروف تھے "لذت کوشی" اور "غیرت سے خالی" "تفریح" کے لیے نہ تو انھیں فرصت تھی اور نہ اس زمانے میں اس کی گنجائش ہی تھی۔ وابستگانِ سلطنت سے قطع نظر صوفیا کا معاملہ بھی کم و بیش یہی تھا۔ وہ بھی اپنی عمر عزیز کا کوئی لمحہ ضائع کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

خسرو کے وقت تک جیسا کہ معلوم ہے ہندوستان میں تمباکو اور حقہ کا چلن نہیں تھا اس لیے پہیلیاں اگر "کھانا کھا کر حقہ پیتے وقت" کی تفریح کا ذریعہ تھیں تو بدیہی طور پر ان کا زمانہ بہت بعد کا ہونا چاہیے خسرو کے وقت تک زبان ہندوی میں منضبط اور مربوط تصنیف کا اب تک نشان نہیں مل سکا ہے۔ صرف چند دوہے اور چوپائی دستیاب ہیں۔ ان کو "صوفی ادب" سے تعبیر کرنا صحیح نہیں۔ فارسی زبان میں البتہ صوفیا کے اقوال اور ملفوظات کے منضبط کیے جانے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور بعض اہم تصنیفی کارنامے بھی سامنے آ چکے

تھے لیکن ان میں بھی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس کا حاصل محض یہ ہو کہ اس سے "کسی قدر ہنسی آجائے" اس وقت کی فارسی تصانیف میں بھی "لذت کوشی" کا میلان نمایاں نہیں ہے۔

اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ناقدین اکثر ایک ہی مسئلہ یا موضوع سے متعلق الگ الگ موقعوں پر مختلف بلکہ بالکل متضاد باتیں بھی کہہ دیتے ہیں۔ خسرو سے منسوب پہیلیوں کے بارے میں ڈاکٹر رام کمار ورما نے ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہوئے ان کی نہایت تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ:

"پہیلیوں کے لیے تو خسرو ممتاز ہیں ہی۔ اس قسم کی پہیلی اور مُکری کہنے والا ہندی ادب میں ایک بھی نہیں ہے۔ اس میدان میں وہ بے مثال ہیں۔" (آلوچناتمک اتہاس ص: ۱۲۰)

راقم نے ڈاکٹر ورما کی کتاب کو بہت احتیاط سے دیکھا۔ واقعی اس میں خسرو کے سوا کسی دوسرے شخص کا ذکر پہیلی گو کی حیثیت سے نہیں ہے۔ ہندی ہی نہیں اردو زبان و ادب کی تاریخیں بھی عموماً خسرو کے سوا کسی دوسرے پہیلی کہنے والے کے ذکر سے خالی ہیں۔ یہ بات سوچنے کی تھی کہ سینکڑوں سال پر پھیلی ہوئی ادبی تاریخ میں یہ کس طرح ممکن ہوا کہ صرف ایک ہی شخص نے پہیلیاں کہیں اور اس شان سے کہ اس کے لیے اس کا نام زندۂ جاوید ہو گیا لیکن کوئی ایک فرد بھی اس سے متاثر ہو کر اس کی اتباع نہیں کرتا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔ پنڈت رامچندر شکل نے ضرور اتنا لکھا کہ:

"سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا اس وقت تک زبان گھس کر اتنی چکنی ہو گئی تھی جتنی پہیلیوں میں ملتی ہے۔" (ہندی ساہتیہ ص: ۵۷) لیکن انھوں نے بھی محض یہ کہہ کر اپنی طبیعت کو مطمئن کر لیا کہ:

"خسرو کا دھیان بول چال کی زبان کی طرف تھا۔" (ایضاً ص ۵۷)

ضرورت اس بات کی تھی کہ شکل جی اس "بول چال کی زبان" کی بھی جستجو کرتے جس کی طرف بقول ان کے خسرو کا دھیان تھا۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی تھی کہ خسرو مسلمان تھے اور ان کی توجہ بول چال کی اس زبان کی طرف ہی ہو سکتی تھی جو مسلم معاشرے میں رائج تھی۔ اس زبان کے نمونے صوفیائے کرام کے ملفوظات میں مل سکتے ہیں۔ خسرو سے منسوب پہیلیوں کی زبان اس سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتی۔

اردو اور ہندی کے سبھی عالموں نے خسرو سے منسوب پہیلیوں [illegible] کو تسلیم کیا ہے۔ پنڈت رام چندر شکل نے لکھا ہے:

"اس میں شبہ نہیں کہ خسرو کے نام سے منسوب پہیلیوں میں کچھ [illegible] اور بعد میں جوڑی ہوئی

پہیلیاں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر حقہ والی پہیلی لیجیے۔ یہ تاریخ سے ثابت حقیقت ہے کہ ہندوستان میں تمباکو کا چلن جہانگیر کے وقت میں ہوا۔ اس کا پہلا گودام انگریزوں کی سورت والی کوٹھی میں تھا۔ اسی لیے تمباکو کا ایک نام سورتی یا سُرتی پڑ گیا۔" (ہندی کا ساہتیہ ص ۵۶)

اسی طرح پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے بھی کہا ہے کہ:

"اس میں شک نہیں کہ بعد کو بہت سی پہیلیاں ان کے نام سے دوسرے لوگوں نے کہہ کر رائج کر دیں اس لیے اب صحیح طور پر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کون سی پہیلیاں واقعی خسرو کی ہیں۔ البتہ جواہر خسروی میں ان کی جو ہندی پہیلیاں ملتی ہیں ان میں سے بعض کے متعلق یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ امیر خسرو کی ہوں گی... لیکن ایسی پہیلیاں یا مکرنے جن کی زبان صاف ہے یا جن میں بندوق، حقہ، چلم وغیرہ ایسی چیزوں کا ذکر ہے جو خسرو کے زمانے میں نہیں تھیں، انھیں خسرو سے کسی طرح منسوب نہیں کیا جا سکتا ہے۔"

(علی گڑھ تاریخ جلد ۱ ص ۲۸۴)

تحقیق میں 'کچھ' اور 'بعض' وغیرہ الفاظ بہت گمراہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ ایک بات کہی جائے اور وہ قطعیت سے کہی جائے تو وہ سینکڑوں "بعض" سے بہتر ہے۔ عموماً جب کوئی مدعیِ تحقیق قطعی بات کہنے سے قاصر ہوتا ہے تو وہ اسی کلمہ کا سہارا لیتا ہے اور نتیجہ کے طور پر غلط اور بے اصل خیالوں کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

جواہر خسروی جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے مولوی محمد امین چڑیا کوٹی کی تالیف ہے اور اس کا زمانہ کچھ قدیم نہیں ہے۔ خسرو کی پہیلیوں کے لیے ان کے کسی معاصر یا قریب العہد مصنف کی سند چاہیے۔ جب یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ دوسروں کی پہیلیاں خسرو سے منسوب ہیں تو تعجب اس پر ہے کہ کسی نے ان مظلوموں کی تلاش کیوں نہیں کی جن کی کاوشیں دوسرے سے منسوب ہو گئی تھیں۔ حافظ محمود خاں شیرانی نے خسرو سے منسوب بعض فنون کے بارے میں حقیقت کا پتہ لگایا۔ اُنھوں نے خالق باری کے بارے میں بھی اس غلط خیال کی تردید کی کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ تعجب ہے کہ اس تحقیقی بصیرت کے باوجود انھوں نے دو سخنوں، چیستانوں اور مکرنیوں کے خسرو سے انتساب کی صحت کو مان کر یہ لکھ دیا کہ:

"یہ چیزیں عام طور سے مشہور ہیں، اس لیے اِن کو نقل کرنے سے احتراز کرتا ہوں۔" (مقالات جلد ۲ ص ۱۴۲)

یہ درست ہے کہ زبان ہندوی میں شعر گوئی کا سلسلہ بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ حضرت فریدالدین گنج شکر وہ پہلے بزرگ ہیں جن کی ایک چوپائی اور ایک دوہہ ایسا دستیاب ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے

خواجہ امیر خسرو کا بھی مستند کلام بہت ہی کم (شاید صرف ایک دوہرا) ملتا ہے۔ اُن کے قریب العہد صوفیا کا جو کلام ملتا ہے وہ بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ بہر حال اُن کے کلام کی زبان ان پہیلیوں کی زبان سے جو خسرو کے نام سے مشہور ہیں بہت مختلف ہے بلکہ غور کیجیے تو خسرو سے منسوب پہیلیاں متعدد اور مختلف بولیوں میں ہیں۔ کسی بھی قدیم مأخذ میں خسرو کے زبانِ ہندوی میں پہیلی کہنے کا مذکور نہیں ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کے شارحِ اکھروتی نے بھی اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے (فہرستِ نسخہ ہائے انجمن۔ ص ۱۴۶) اس کا مطلب صاف یہی ہے کہ اُس زمانے تک خسرو سے پہیلیوں کو منسوب نہیں کیا گیا تھا۔ یا اگر کیا گیا تھا تو اُسے شہرت نہیں ملی تھی۔ یہی نہیں بلکہ شاید فارسی میں بھی چیستان گوئی کی قدامت ثابت نہیں ہے۔ راقم کے علم میں ۱۱۶۲ھ/ ۱۷۴۹ء کی ایک بیاض میں "چیستان ہا" کا اندراج کیا گیا تھا۔ (فہرست موزۂ ملی ص۔ ۱۳۱) یعنی محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں چیستان گوئی کو رواج تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ اردو میں پہیلی کہنے کا سلسلہ عالم گیر اورنگ زیب کے بعد یا زیادہ سے زیادہ اُس کے عہد میں شروع ہوا ہوگا۔ خسرو سے پہیلیوں کا انتساب شاید تیرھویں صدی ہجری کے آغاز/ آٹھارویں صدی عیسوی کے خاتمہ میں یا اس کے بعد کیا گیا ہوگا۔

پہیلی گوئی کا آغاز غالباً دہلی میں اردو شاعری کے رواج سے کچھ پہلے کا واقعہ ہے۔ لشکریوں کے واسطے سے جب وہاں شعرائے دکن کا کلام پہنچا تو فارسی کے زباندانوں کو تفریح کا ایک ذریعہ ہاتھ آیا۔ انھوں نے زبانِ ہندوی کے کچھ ایسے لفظ نکال لیے جو فارسی میں مختلف معنی میں رائج تھے۔ ایسے لفظوں کو بول کر وہ لطف لینے لگے۔ پھر الفاظِ ذو معنین کے صرف نے اُنھیں ایہام گوئی کی راہ دکھائی۔ "فرقۂ مقبولیہ تبدیلیہ" یعنی مرزا مقبول اور ان کے بیٹے مرزا گرامی کے شاگردوں اور عقیدت مندوں نے اسی کو اپنے کلام کا طرۂ امتیاز بنا لیا۔ انھیں کے اثر سے اردو میں ایہام گوئی کا سلسلہ جاری ہوا۔ اسی نے دوسخنوں کی صورت اختیار کرلی۔

ڈاکٹر رام کمار ورما نے دوسخنے (جسے وہ دو کہنا کہتے ہیں) مکرنی اور ڈھکوسلے کو بھی پہیلی میں شامل کرلیا ہے۔ اور اس طرح پہیلی کی چھ قسمیں بیان کی ہیں (آلوچناتمک اتہاس۔ ص ۱۲۰) لیکن ان سب میں فرق کیا جانا چاہیے۔ دوسخنے کو مولوی سید احمد دہلوی نے "نسبت" بھی کہا ہے اور لکھا ہے:

"نسبتیں اصل میں علاحدہ علاحدہ فقرے ہوتے ہیں کہ اُن میں دو یا زائد چیزوں کا جن میں اعتبارِ ظاہر کچھ مناسبت نہ پائی جائے، بیان کرتے اور مخاطب سے پوچھتے ہیں کہ ایسی جامع بات بیان کرو جہاں سب کا جواب ہو جائے۔" (دیباچہ فرہنگ آصفیہ ص ۶۳)

قدما کے یہاں دو سخنوں کی کئی صورتیں معلوم ہوتی ہیں جو شاید اس صنف کے ارتقا کی مظہر ہیں یعنی :

۱ ـــ ایک سوال فارسی میں، دوسرا اردو میں؛ دونوں کے جواب فارسی میں بہ طرز ایہام لیکن اُن میں سے ایک ایسا جو اردو لغت کے مطابق بھی ہو۔ مثال :

سوال	جواب	کیفیت
الف۔ شکار بچہ می باید کرد ؟	بادام	= جال سے (فارسی)
قوت مغز کو کیا چاہیے ؟؟	بادام	= میوۂ معروف
ب۔ شکاری را چہ می باید ؟	دام	= جال (فارسی)
مسافر کی گانٹھ میں کیا چاہیے ؟؟	دام	= رقم

۲ ـــ ایک سوال فارسی میں، دوسرا اردو میں۔ دونوں کے جواب میں ایک ایسا لفظ جس کے ایک معنی فارسی میں ہوں اور دوسرے اردو میں۔ مثال :

الف۔ تشنہ را چہ می باید ؟	چاہ	= کنواں (فارسی)
ملاپ کو کیا چاہیے ؟؟	چاہ	= محبت (اردو)
ب۔ سوداگر را چہ می باید ؟	دوکان	= {عربی میں یہ لفظ دُکّان ہے۔ فارسی میں بغیر تشدید کاف بھی ہے لیکن دال کے بعد واؤ لکھنا اور پڑھنا غلط ہے۔}
بُوچے کو کیا چاہیے ؟؟	دُو کان	= کان دُو عدد

۲ ـــ دونوں سوال اردو میں، ایک جواب فارسی میں، دوسرا بھی فارسی میں بطرز ایہام لیکن اس طرح کہ وہ اردو میں بھی رائج ہو۔ مثال :

الف۔ انار کیوں نہ چکھا ؟	دانا نہ تھا	= دانہ
وزیر کیوں نہ رکھا ؟؟	دانا نہ تھا	= دانا = عقلمند
ب۔ ڈول بھجائی کیوں نا ؟	پردہ نہ تھا	= پردہ = اوٹ، چھپنے کی چیز
سارنگی بجائی کیوں نا ؟؟	پردہ نہ تھا	= پردۂ ساز

۳ ـــ دونوں سوال اردو میں اور دونوں جواب بھی اردو میں ہی۔ مثال :

الف۔ جوتا کیوں نہ پہنا ؟	تلا نہ تھا	= جوتے کا تلا
سنبوسہ کیوں نہ کھایا ؟؟	تَلا نہ تھا	= تلنا کا ماضی

ب ۔ گوشت کیوں نہ کھایا؟   گلا نہ تھا   ۔ گلنا کا ماضی

ڈوم کیوں نہ گایا؟؟   گلا نہ تھا   ۔ حلق

محمد شاہ بادشاہ کے عہد تک دوسخنوں کا رواج اس حد تک ہوگیا تھا کہ روزمرہ اور بات چیت میں بھی لوگ ان کو برتتے تھے۔ امیر اللہ الہ آبادی نے اپنے تذکرہ مسرت افزا (تالیف ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء) میں عمدۃ الملک امیر خاں انجام کے ذکر میں لکھا ہے:

" گویند یکبار خاندوراں روبروے بادشاہ از امیر خاں گفت کہ در آخر لفظ ہر فرقہ کہ لفظ بان باشد یقین باید دانست کہ او حرامزادہ و شورہ پشت است مثل فیلبان و شتربان وبہلبان۔

امیر خاں گفت: راست میگوئید اے مہربان۔" (بحوالہ معاصر حصہ ۵)

کہہ مکرنی غالباً دوسخنہ ہی کی ارتقائی صورت ہے جس میں دو معنی ملحوظ ہوتے ہیں اور قائل اُن میں سے ایک سے مکر سکتا ہے۔ مولوی سید احمد دہلوی نے لکھا ہے:

"کہہ مکرنی میں عورتوں کی زبان سے ذو معنی بات بیان کی جاتی ہے جس میں ایک سے معشوق مراد ہوتی ہے اور دوسرے معنی سے کچھ اور۔ اس کا قائل جب چاہتا ہے معشوق کی بات کہہ کر مکر جاتا ہے انھیں کو سکھیاں اور مکرنیاں بھی کہتے ہیں۔" (دیباچہ فرہنگ آصفیہ ص ۶۱)

اس کی مثالیں اس طرح ہیں ؎

سرخ و سفید ہے واکا رنگ
سانگ بھری ہیں واکے سنگ
گلے میں کنٹھا کالے گیسو
اے سکھی ساجن؟ نا سکھی ٹیسو

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ کہہ مکرنی اور دوسخنے میں ایک بدیہی فرق یہ ہے کہ جو بات کہی جا رہی ہے اس کا تعلق دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ دوسخنہ کے برخلاف سوال ایک اور جواب دو ہوتے ہیں۔ جبکہ دوسخنے میں دونوں جواب مذکور ہوتے ہیں۔ کہہ مکرنی کی جتنی مثالیں ہمارے علم میں ہیں سب منظوم ہیں اور یہ

بہ صورت مثنوی ہیں۔

پہیلی کہہ مکرنی کی ترقی یافتہ صورت معلوم ہوتی ہے۔ میر علی اوسط رشک نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

"پہیلی۔ کلامیکہ نام و مطلب دراں پنہاں دارند۔ ف چیستان (نفس اللغہ ص ۱۲۵)

مولوی سید احمد دہلوی نے کسی قدر تفصیل سے کام لیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"پہیلی میں کسی چیز کے اوصاف و خصایص اور پتے بیان کر کے مخاطب سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے جس میں اتنے وصف ہیں۔ پہیلی میں یہ بڑی خوبی کہلاتی ہے کہ اس میں اس چیز کا نام بھی آجائے۔" (دیباچہ فرہنگ آصفیہ ص ۶۰)

پہیلی میں کسی چیز، کیفیت یا واقعہ کو غور و فکر و تلاش و جستجو کے بعد سمجھنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ اس کے لیے حاضر دماغی اور طبیعت کی نکتہ رسی شرط ہے۔ یہ درست ہے کہ ابتدا میں پہیلی محض تفنن طبع کا ذریعہ تھی۔ لیکن بتدریج اس میں افادیت کی صورتیں پیدا ہوتی گئیں۔ یہ صنف ذہنی ورزش کا ذریعہ بھی رہی ہے اور نتیجہ کے طور پر فکر کو جلا دیتی ہے۔ اور اس اعتبار سے بھی یہ کارآمد اور مفید ہے۔

معمول کے مطابق شروع شروع میں پہیلیاں بھی منظوم ہوتی تھیں، لیکن بعد میں نثری پہیلیاں بھی کہی جانے لگیں۔ پہیلی کے لیے اختصار کی بہت اہمیت ہے۔ اچھی پہیلی وہ ہے جو دو فقروں یا دو مصرعوں پر مشتمل ہو لیکن بہت سی پہیلیاں چار مصرعوں پر بھی پھیلی ہوئی ہیں۔ چار مصرعوں سے زائد کی پہیلیاں بھی کہی گئی ہیں، لیکن یہ طوالت مستحسن نہیں ہے۔ اختصار ہی پہیلی کا حسن ہے۔ پہیلی کا جواب بھی ایک لفظی یا دو لفظی ہو تو بہتر ہے۔

پہیلی کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل وہ جن میں جواب موجود ہوتا ہے۔ دوسری وہ جن کے لفظوں میں جواب پوشیدہ نہیں ہوتا صرف قرائن اور اشارے ہوتے ہیں۔ ان اشاروں کو بہت کھلا ہوا نہیں ہونا چاہیے لیکن قطعی ہونا ضروری ہے تاکہ جواب کا تعین ہو سکے اور کوئی شبہ یا ابہام نہ ہو۔ ان اشاروں کے پوشیدہ اور قطعی ہونے پر ہی پہیلی کی کامیابی کا انحصار ہے تاکہ مخاطب خوب غور کرنے اور سوچنے پر مجبور رہے۔ اس قسم کی پہیلی کہہ لینا خود شاعر کی ذہانت اور لیاقت کی بھی غمازی کرتا ہے۔

کہا جا چکا کہ شروع میں پہیلیاں تفریح و تفنن کے لیے کہی گئی تھیں۔ ان میں الفاظ ذو معنین کا صرف کیا جاتا تھا یعنی پہیلی کا تعلق براہ راست ایہام گوئی سے تھا۔ بعد میں ایہام گوئی کا زوال ہوا۔ سادہ گوئی کا رواج ہوا۔ پہیلی کہنے والوں نے بھی روزمرہ بلکہ بول چال کی زبان کا استعمال کیا۔ پہیلی کا تعلق نجی صحبتوں سے ہو گیا جب فرصت کے

اوقات میں آدمی غور و فکر کرسکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں گھریلو بلکہ عوامی بول چال کو اختیار کیا گیا۔ اس نے پہیلی کے وقار کو نقصان پہنچایا، اور معیاری اور ثقہ شاعروں نے یا تو اس صنف میں طبع آزمائی کی ہی نہیں یا اگر چند پہیلیاں کہیں تو اُن کو اپنے دیوان میں شامل نہیں کیا۔ پہیلیاں زبانوں پر جاری رہیں اور اُن کے خالق کا نام ذہنوں سے محو ہو گیا۔

پہیلی کہنے کے لیے موجودہ معلومات کی حد تک عمدۃ الملک امیر خاں انجام کو اولیت حاصل ہے۔ اُن سے قدیم تر کسی شخص کی کہی ہوئی کوئی پہیلی ہمارے علم میں نہیں ہے۔ غلام محی الدین عشق و مبتلا نے پہلی بار اپنے تذکرہ طبقاتِ سخن (تالیف ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء) میں انجام کے پہیلی کہنے کا ذکر کیا ہے:

"از ابنائے شاہ نعمت اللہ ولی است کہ مکمل اولیا بودہ اند۔ میل خاطر از بس بطائبہ و مزاح داشت اکثر پہیلی می فرمود۔" (بحوالہ ہماری زبان۔ ۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء)

اسی تذکرے کے حوالے سے اسپرنگر نے بھی لکھا ہے: "انجام — زیادہ تر پہیلیاں لکھتے تھے"۔ عشق و مبتلا نے انجام کی یہ پہیلی نقل کی ہے ؎

دیکھ بھال پھلی ہے سرسوں   آج نہ جیا توں جاتوں پرسوں

قدیم تر تذکروں میں بھی یہ مطلع منقول ہے لیکن کسی نے اسے پہیلی نہیں کہا ہے۔ اس کے پہلے مصرع میں پہیلی کا جواب "سرسوں" موجود ہے۔ "پہیلی نامے" کے مرتب نے اسے "پہیلیاں حضرت امیر خسرو" کے تحت لکھا ہے۔

انجام کے زمانے میں ایہام گوئی کا رواج تھا۔ وہ خود بھی اس صنعت سے دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی مذکورہ پہیلی میں بھی اس صنعت کا صرف ہوا ہے۔ انجام الٰہ آباد میں تعینات تھے۔ عین ممکن ہے کہ ان کے اثر سے اس خطے میں پہیلی گوئی کا چلن ہوا ہو۔ الٰہ آباد اور اس کے اطراف کے شعرا کے یہاں پہیلی کے ابتدائی نمونوں کی جستجو کی جانی چاہیے۔

مرزا مظہر اور ان کے متبعین نے ایہام گوئی کی مخالفت میں جو [illegible] حاصل کی تھی اُسی کا نتیجہ ہے کہ یہ طرزِ شاعری متروک ہوا۔ سادہ گوئی کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس صورت حال نے پہیلی کہنے کے انداز کو بھی متاثر کیا۔ شیخ چاند نے دیوان سودا کے اس نسخے سے جو ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۱ء میں لکھا گیا تھا کچھ مثالیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں، ایک یہ ہے:

پہیلی آتشبازی:
رات سمیں ایک میوہ آیا   پھولوں [illegible] سب کو بھایا
آگ دیوے ہووے روکھ   پانی دیوے جاوے سوکھ

اس میں نہ ایہام ہے، نہ الفاظ ذو معنین کا استعمال ہے۔ پہیلی میں اس کا جواب [illegible] سے موجود نہیں ہے۔ البتہ قرائن سب موجود ہیں۔ لفظ میوہ نے اس آتشبازی کے نام کا تعین بھی کر [illegible] سودا کی یہ پہیلی بھی مختلف لوگوں نے بہ شمول مولوی سید احمد دہلوی خواجہ امیر خسرو سے منسوب کی ہے۔

اسی زمانے کی سودا کی ایک دوسری پہیلی یہ ہے:

پہیلی نرگس:

تریا ایک سبھا کے بیچ روپا سونا وا کے سیس
مینا جیسے وا کے پاؤں چھیری جیسے وا کے ناؤں

اس پہیلی کا انداز بھی وہی ہے اور یہ بھی خسرو کے نام سے مشہور ہے۔ فی الوقت یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ پہیلیاں سودا نے کس مقام پر کہی تھیں کیونکہ ۱۱۷۰ھ سے کافی پہلے سودا دہلی چھوڑ چکے تھے۔

سودا نے اپنی کئی پہیلیوں میں تریا اور ناری وغیرہ کی تشبیہ سے کام لیا ہے چنانچہ ایک پہیلی میں یہ کہتے ہیں:

پہیلی باز: بعضی بات کہی نا جائے ناری ہو کر نر کہلائے

ایک پہیلی میں "بوبو" اور "رانی" سے فائدہ اٹھایا ہے:

پہیلی بورانی: آدھی بو بو ساری رانی جو بوجھے سو بڑا گیانی

یعنی بوبو کے آدھے کو رانی کے ساتھ ملاؤ تو بورانی حاصل ہو جائے گا۔ یہ دونوں پہیلیاں بھی فرہنگ آصفیہ میں خسرو ہی سے منسوب ہیں۔

اپنی بعض پہیلیوں کے آخر میں سودا یہ مصرع لائے ہیں ع بوجھ پہیلی یا چھانڈو گاؤں۔ چنانچہ ذیل کی پہیلی میں بھی ہے:

پہیلی خوب کلاں:

انگ سی میں دیکھی نار چھت ہے واکو سب سنسار
بھلی بڑی ہے وا کا ناؤں بوجھو پہیلی یا چھانڈو گاؤں

سودا کی ایک مختصر سی پہیلی یہ بھی ہے:

پہیلی لالہ: رکت برن اور بجو میں ٹھاؤں ناہیں ناہیں وا کو ناؤں

کسی نے اسی کے دوسرے مصرع کو سودا کے اول الذکر مصرع سے ملا کر پہیلی اس طرح پوری کی ہے

ناہیں ناہیں وا کا ناؤں ارتھ کہو یا چھاڈو گاؤں

اور مرتب پہیلی نامہ نے اسے خسرو کے نام سے نقل کر دیا ہے۔ پھر انیسویں صدی کے وسط کے ایک شاعر حکیم تمل رسول خاں تمل نے انھیں لفظوں میں گل لالہ کی پہیلی لکھدی ہے

حکم نمانی وا کا ناؤں ارتھ کہو یا چھاڈو گاؤں

سودا کی پہیلیوں میں کوئی خاص پیچیدگی نہیں ہے۔ وہ کبھی لفظی ترجمے سے، کبھی کسی لفظ کے مفہوم سے اور کبھی اس کی تحریری صورت سے اپنی پہیلی کو ترتیب دیتے ہیں۔ اس ابتدائی منزل میں شاید اس سے زیادہ کا خیال کرنا ممکن بھی نہیں تھا۔

اپنی آخری عمر میں سودا پورب کے علاقے میں جا رہے تھے۔ عمدۃ الملک امیر خاں انجام وہاں پہیلی گوئی کے بیج بو چکے تھے۔ اب سودا کے اثر سے یہ نہال برگ و بار لایا۔ انشا اور رنگین جیسے باصلاحیت شعرا نے اس طرف توجہ کی اور اسے اعتبار کے درجے تک پہنچا دیا۔ رنگین نے ایک سے زائد جگہوں پر پہیلی کا اردو شاعری کی مسلّم اصناف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اپنی پہیلیوں کو اپنے مجموعۂ رنگین میں ذیل کے عنوان سے درج کیا ہے:

"پہیلی ہائے نظم در ہندی زبان پوربی یعنی چیستان" (سعادت یار خاں رنگین ص ۲۳۶)

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ اردو اور ہندی کے ماہرین لسانیات میں سے تقریباً سبھی نے خسرو کی پہیلیوں کا تو ذکر کیا ہے لیکن بیشتر نے ان پہیلیوں کے "بزبان پوربی" ہونے کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا ہے جب کہ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس صنف کو پوربی زبان زیادہ راس آئی ہے۔ دلّی میں نابینا بادشاہ شاہ عالم نے اپنی طویل نثری داستان عجائب القصص میں سوالوں کا جواب ضرور طلب کیا ہے لیکن اُسے غالباً پہیلی سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

رنگین نے اپنے مزاج کے مطابق پہیلی کہنے میں کئی طرح کی جدتیں کیں۔ سودا کے کلیات میں سب سے طویل پہیلی چھ شعروں پر مشتمل ہے۔ رنگین نے پہیلی چار وب یعنی چہار وُد میں آٹھ شعر کہے ہیں۔ دوسری جدت جس کی طرف انھوں نے خود ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے، یہ ہے:

"ضرب المثل ہائے نثر کہ آں را پہیلی کردہ ام۔" اس قسم کی پہیلیاں کئی ہیں مثلاً:

پہیلی پالکی: دس کی لاٹھی، ایک کا بوجھ (سعادت یار خاں رنگین ص ۲۳۷)

سید انشا کئی زبانوں سے واقف تھے۔ انھوں نے پہیلیوں میں بھی اپنے علم و فضل کا اظہار کیا ہے۔ ان کے کلیات میں ذیل کے عنوان سے پہیلیاں درج ہیں:

"قطعات چیستان و پہیلی ہا"

اور انھوں نے بہت اہتمام سے پہیلیاں لکھی ہیں۔ پہلی پہیلی خدا کے نام سے متعلق ہے۔ اُس کے بعد فارسی زبان میں کچھ چیستان ہیں اور پھر دو چیستان بزبان ترکی ہیں۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ فارسی میں چیستان گوئی کا سلسلہ اردو سے قدیم تر ہے لیکن ترکی میں پہیلی کہنے کو انشا کی اولیت میں شمار کرنا شاید غلط نہ ہو۔ پہیلی جیسی عوامی صنف کو علم و فضل کے اظہار کا [illegible] بنا دینا بھی انشا کے امتیازات میں سے ہے بلکہ انصاف کی بات یہ ہے کہ انشا کے بعد ہی اس صنف کی اہمیت اور افادیت کا [illegible] ہوتا ہے۔ انھوں نے مختلف زبانوں کی لفظیات سے فائدہ اٹھا کر پہیلی سے تعلیم و تدریس کا بھی اسی طور پر کام لینے کی کوشش [illegible] جس طرح کسی زمانے میں نصاب الصبیان جیسی کتابوں سے یہ کام لیا جا رہا تھا۔ مثال:

پہیلی آب در زبان اردو: پانی ماء (عربی) اور پانی باپ (پنجاب) اس کا اشارہ [illegible]

قطع نظر اس سے کہ اس میں پانی کے عربی اور فارسی متبادل "ماء" اور "آب" کی طرف اشارہ ہے بیان کے انداز میں بھی وہی شائستگی ہے کہ جو کتابی اردو کے امتیازات میں ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ انشا کی پہیلیوں کی زبان دوسرے پہیلی گویوں سے مختلف ہے۔ اپنی "پہیلی سیب و الماس" میں انشا نے ایک مصرع اس طرح کہا ہے۔ ؎ ترکی سمجھے سو یہ بوجھے

اس پس منظر میں خواجہ امیر خسرو سے منسوب اس پہیلی کو دیکھا جائے[1]:

پہیلی آئینہ : فارسی بولی آئی نا ترکی ڈھونڈی پائی نا

ہندی بولوں آرسی آئے خسرو کہے نہ کوئی بتائے

غور کریں تو اس میں انشا کی پہیلیوں سے بہت زیادہ مطابقت موجود ہے۔ بہ گمان غالب یہ عہد انشا کی تخلیق ہوگی۔

رنگین اور انشا کے زیر اثر پہیلی کو یہ وقار حاصل ہو چکا تھا کہ ان کے بعد مختلف شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی چنانچہ سید حسین شاہ حقیقت نے بھی متعدد پہیلیاں کہی ہیں جو صنم کدۂ چیں میں مندرج ہیں۔ حیدرآباد کے کتب خانۂ سالار جنگ میں پہیلیوں کے دو قلمی مجموعے ہیں ان کے بارے میں ڈاکٹر رحمت علی خاں نے اطلاع دی ہے کہ:

"اس مجموعے میں انیس سو پہیلیاں اور ایک سو چالیس چیستان ہیں۔ مخطوطہ انیسویں صدی کے اوائل (تیرھویں صدی ہجری کے اواسط) میں شکستہ نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ اس میں درمیانی سائز کے ایک سو ایک ورق ہیں۔ دوسرا نسخہ مجموعۂ پہیلیاں کے نام سے ایک سو انچاس اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں دو ہزار چالیس قطعات ہیں۔ اس کا خط اور زمانہ کتابت بھی وہی ہے۔"

راقم کی درخواست پر ان دونوں مجموعوں کو جناب رحمت یوسف زئی نے ملاحظہ فرمایا اور اس کے بعد اس کے مفصل کوائف سے نوازا لکھتے ہیں:

"پہلا مخطوطہ پہیلیاں و چیستاں کے عنوان سے ہے۔ ابتدا کے ۱۰۵ صفحات پر ۱۲۷۸ پہیلیاں درج ہیں ۸۹۲ پہیلیوں کے بعد یوں درج ہے:

کیفیت۔ یہ سب پہیلیاں کہی ہوئی ایک شخص نواب مہدی علی خاں کی ہیں۔

۸۹۲ پہیلیوں کے بعد متفرقات درج ہیں۔ ۱۱۵۵ ویں پہیلی امیر خسرو کے نام سے ہے۔ تخلص موجود ہے۔ اسے میں پڑھ نہیں سکا۔ ۱۲۷۸ پہیلیوں کے بعد یوں لکھا ہے:

متفرقات۔ اب یہاں سے پہیلیاں بطریق سہ حرفی کے لکھی جاتی ہیں۔ مثال

---

[1] صنم کدۂ چیں کے مرتب نے بھی ۴۶۲ / ۱۱۹۳ صفحہ میں اس پہیلی کو خسرو ہی سے منسوب کیا ہے لیکن یہ انتساب اس کے خسرو سے ہونے کیلئے کافی ثبوت نہیں ہے۔

باور چیخانہ = یقین کا گھر

بندر = جنگل میں گھر،

یہ پہیلیاں تعداد میں ۹۴ ہیں۔ صفحہ ۱۴۹ پر یوں لکھا ہے:

"اب یہاں سے چند کہ مکرنیاں تحریر کی جاتی ہیں" پھر یہ عنوان ہے:

"اب یہاں سے وہ چیزیں لکھی جاتی ہیں کہ دو سوال سائل کرے اور سا تھ ایک جواب دے"

پھر — "اب یہاں سے پہیلیاں من تصنیف خدا بخش ولد شیخ محمد پناہ جاجی این کتاب متخلص بہ مجلت ساکن لکھنؤ بمحلہ پاٹا نالہ، مرقومہ ۲۵۔ ذیقعدہ ۱۲۷۸ھ" صفحہ ۱۶۵ سے چیستان درج ہیں جن میں سے ایک یہ ہے ؎

چیست آں یکدرخت شاخش چار میوہ بر شاخ رنگ رنگ شمار

صفحہ ۱۸۰ پر یہ عبارت ہے: "اب یہاں سے پہیلیاں فکر کی تصنیف کی گئی تحریر ہیں"۔

اس میں مہدی علی خاں سے مراد نواب مہدی علی خاں مہدی تخلص، رئیس بنارس متوسل قاسم علی خاں صوبہ دار بنگالہ (خوش معرکہ جلد ۲ ص ۵۶۰) اور فکر سے شیخ ذوالفقار علی شاگرد محمد علی خاں اسحا ق (ایضاً جلد ۲ ص ۷۶ ۱۲) ہیں۔ ایک اندراج پر تاریخ موجود ہے اس لیے کچھ شبہ نہیں کہ یہ مجموعہ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱-۶۲ء میں لکھا گیا ہوگا۔ اس میں نثری پہیلی کی ایک اور قسم "سہ حرفی" سامنے آئی لیکن اس عنوان سے کچھ پہیلیاں ایسی بھی لکھی ہیں جن میں صرف دو کلمے ہیں۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ فارسی چیستان کی جو مثال نقل کی گئی ہے وہ بھی توجہ طلب ہے۔ اس مجموعے کے مرتب خدا بخش مجلت کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔

کتب خانۂ سالار جنگ کے دوسرے نسخے کا تعارف جناب رحمت یوسف زئی نے اس طرح لکھ کر ارسال کیا ہے:

"دوسرا مخطوطہ 'مجموعۂ پہیلیاں' کے عنوان سے ہے۔ اس کے جملہ ۹۸ صفحات ہیں۔ اس میں پہیلیاں مختلف زمروں میں بانٹ دی گئی ہیں۔ جیسے لطفائے جسمانی، لباس، غذا وغیرہ۔ پھر ہر عنوان کے تحت حروفِ تہجی کے اعتبار سے لکھا گیا ہے۔ ساتھ ہی شاعر کا نام بھی بتا دیا گیا ہے۔ جہاں شاعر کا نام معلوم نہیں وہاں 'لا اعلم' لکھا گیا ہے۔ جملہ ۴۰۰ پہیلیاں ہیں۔ (اس میں بھی خسرو کے نام سے پہیلیاں لکھی ہیں۔) مہدی علی خاں، عیش، خطاب، رنگین اور جرأت وغیرہ کی پہیلیاں اس میں ہیں:"

اس مجموعہ میں مجلت سے مراد وہی خدا بخش مجلت ہے۔ اس بنا پر اس کے مرتب کیے جانے کا زمانہ [illegible] پیش وہی ہوگا۔ ان دونوں مجموعوں سے

پتا چلتا ہے کہ شعرا نے اس صنف میں خوب خوب طبع آزمائی کی تھی۔ اور بیشتر شاعر جنھوں نے پہیلی گوئی سے دلچسپی لی ہے یوپی کے مختلف علاقوں کے رہنے والے تھے۔

جناب مشفق خواجہ کی مرتب کردہ فہرست "جائزہ مخطوطات اردو" جلد اول میں بھی ایک بیاض کا ذکر ہے جو کبھی ڈاکٹر یونس حسنی استاد اردو، کراچی یونیورسٹی کے قبضہ میں تھی۔ اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس کے صفحہ ۲۲ میں :

"پہیلیاں ہیں جو مرتب نے مختلف ذریعوں سے جمع کی ہیں۔ ان کی تعداد ۲۸۸ ہے۔"

یہ بیاض ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء اور ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء کے درمیان میں جمع کی گئی تھی۔ اب بیاض یونیورسٹی کے کتب خانہ میں داخل ہے

یقینی ہے کہ ایسے مجموعے اور بھی ہوں گے۔ ان کی جستجو کی جائے تو اس صنف کے بارے میں بہتر معلومات حاصل ہو سکیں گی۔ پہیلیوں کا ایک بہت مختصر سا مجموعہ الطاف رسول الطاف دہلوی نے بھی مرتب کیا اور غالباً یہی پہلا مجموعہ ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہو سکا ہے۔ اس کے سرورق کی عبارت اس طرح ہے[1] :

"ماشاءاللہ لا قوۃ الا باللہ، ۱۲۹۳ھ، بندر نامہ، و برحاشیہ، ۱۸۷۶ء، پہیلی نامہ، در مطبع نارائنی واقع دہلی طبع شد"

مرتب نے "پہیلی نامہ" پر مختصر سا دیباچہ بھی لکھا ہے۔ اس طرح :

"بعد حمد رب العالمین و نعت سید المرسلین عرض کرتا ہے عاصی الطاف رسول دہلوی کہ ان دنوں میں اس ہیچمداں نے پہیلیاں استادانِ متقدمین و متاخرین کی انتخاب کر کے بطریق اختصار مجتمع کیں اور واسطے ملاحظہ شائقین کے مرغوب خاطر اور دریا مقاطر ہوں۔ اغلب کہ پسندِ خاطر عاطر ہوں۔ فقط"

مرتب کے حالات راقم کو بالکل معلوم نہیں ہو سکے البتہ اس بنا پر کہ کتاب کے آخر میں محمد یعقوب یعقوب دہلوی کے قطعۂ تاریخ سے اس کا سال اتمام ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء معلوم ہوتا ہے، خیال ہے کہ اس کی طباعت دس برس کے بعد ممکن ہو سکی تھی۔ کتاب کی ضخامت سرورق کو ملا کر کل آٹھ صفحہ کی ہے۔ مشمولات اس طرح ہیں :

	تعداد
پہیلیاں حضرت امیر خسرو کی	۸
پہیلیاں ابو ظفر بہادر شاہ بادشاہ غازی مرحوم کی	۲
پہیلیاں طبعزاد جناب آغا جان صاحب عیش کی	۹

---

[1] راقم کو یہ کتاب عزیز محترم جناب میر الٰہی درم... نے عنایت کی ہے۔ راقم ان کا ممنون ہے۔

پہیلیاں طبع زاد حکیم تحمل رسول خاں تحمل خلف ممتاز الدولہ نواب غلام رسول خاں مغفور ۸

پہیلیاں متفرقات ۱۱

پہیلیاں از نتائج طبع خواجہ ممتاز ہندی لکھنے والا ۲

کل	۴۲

الطاف کے ماخذ کا ہمیں علم نہیں لیکن چونکہ اُس نے بھی بعض پہیلیاں خواجہ امیر خسرو سے منسوب کی ہیں، یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اس سے پہلے بھی کسی نے اس بات کا ذکر کیا تھا۔ اس کی جستجو کی جانی چاہیے۔ اس پہیلی نامے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں دلّی والے بھی یہ پہیلی کہنے لگے تھے۔

پنڈت رامچندر شکل نے خسرو کے نام سے ایک پہیلی اس طرح نقل کی ہے:

چوک بھی واسوں ایسی — دیس چھوڑ بھیو پردیسی — (ہندی ساہتیہ ص ۵۷)

اس سے بات واضح نہیں ہوئی۔ پہیلی نامہ میں مکمل پہیلی اس طرح تحریر ہے:

بدھنا نے ایک پُرکھ بنایا — تریا دی اور رُت لگایا
آدم و حوّا:
چوک ہوئی کچھ واسے ایسی — دیس چھوڑا اور ہوا پردیسی

اگرچہ پہیلی نامہ میں بھی یہ پہیلی خسرو ہی سے منسوب ہے، انتساب کی غلطی کی کئی مثالیں اوراقِ گذشتہ میں دی جاچکی ہیں اس لیے اسے بھی ایسا ہی سمجھنا چاہیے۔ اس کی زبان بھی قدیم نہیں ہے۔

پہیلی نامہ میں حکیم آغا جان عیش کی پہیلیوں میں ایک یہ بھی ہے ؎

ایک تھال موتیوں سے بھرا — سب کے سر پر [illegible] دھرا
چاروں طرف وہ تھال پھرے — موتی اس سے نا گرے

پنڈت رام چندر شکل نے اس پہیلی کو بھی خسرو ہی کے نام سے لکھ دیا ہے۔ (ہندی ساہتیہ ص ۵۷) اس کی زبان بھی جدید ہے اور پہیلی نامہ کے اندراج کی صحت کی مؤید ہے۔

پہیلی نامہ کی ترتیب سے کچھ ہی پہلے پیارے لال آشوب اور کپتان [illegible] نے ایک کتاب "رسوم ہند" کے نام سے تیار کی۔ جناب خلیل الرحمان داؤدی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

"۱۸۶۴ء میں جب کہ میجر فُلر ناظم تعلیمات تھے، حکومت پنجاب نے [illegible] زبان میں اعلیٰ درجے کی تصانیف تیار کرانے کے لیے ایک کمیشن قائم کیا۔ ... رسوم ہند اُسی کمیشن کی حسن کار[illegible] ایک یادگار ہے۔ اس کتاب کی تالیف

کمیشن کے قیام ۱۸۶۷ء کے فوراً بعد ہی شروع ہو گئی۔" (رسوم ہند۔ ص ب)

اس کتاب میں پہیلی کہنے اور بوجھنے کے عمل کی بہت عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ من سکھی اور سندر سنگھ کے قصہ میں ہے:

"من سکھی نے کہا:۔ نہیں بہن! لے میں ایک پہیلی کہوں، بتائیگا؟

موہنا نے کہا:۔ کہو۔

من سکھی بولی:۔ کھیت میں اُپجے سب کوئی کھائے گھر میں ہوئے تو گھر بہہ جائے

موہنا نے جواب دیا:۔ بھلی پہیلی کہی۔ یہ تو پھوٹ ہے پھوٹ۔

پھر من سکھی نے کہا:۔ اچھا یہ بتا۔ ہری تھی، من بھری تھی، سوا لاکھ موتی جڑی تھی۔

راجہ جی کے باغ میں، دوشالا اوڑھے کھڑی تھی

موہنا نے کہا:۔ مجھ سے یہ تو نہیں بتائی جائے۔ تو ہی بتا دے۔

وہ بولی:۔ کہو، ہار ا بھک مارا، کنوئیں کا پنہارا

موہنا نے کہا:۔ یہ تو نہیں کہوں۔ من سکھی نے کہا۔ اچھا تو بتا ہی دوں، بھٹا۔ ہے۔" (رسوم ہند ص ۱۳۴-۱۳۳)

یہ اقتباس پہیلی بجھانے کے انداز، نہ بوجھ سکنے کی صورت میں اعتراف عجز کے طور پر مقررہ جواب کا بڑے فطری طور سے بیان ہوا ہے۔

ظاہر ہے کہ پہیلیاں بجھاتے وقت ان کے مصنف کے نام کی تلاش و تحقیق کا خیال نہیں کیا جاتا تھا صرف پہیلی یاد رکھی جاتی تھی۔ چنانچہ ضرورت پڑنے پر مصنف کی حیثیت سے کوئی مشہور نام لے لیا جاتا تھا۔ دہلی کے آس پاس کے علاقوں میں ذہانت فراست اور بدیہہ گوئی کے لیے خواجہ امیر خسرو کے نام سے بہتر کس کا نام ہو سکتا تھا۔ بس ہر پہیلی رفتہ رفتہ انھیں سے منسوب ہوتی چلی گئی اور اب تمام پہیلیوں کے بلا شرکت غیرے مصنف وہی مشہور ہیں۔ اردو ہندی میں پہلی ادبی تاریخ لکھنے کا سہرا مولانا محمد حسین آزاد کے سر ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں شہرت عام پر اعتماد کر کے لکھ دیا کہ:

"امیر خسرو نے کہ جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی بہت سی پہیلیاں عجیب و غریب لطافتوں سے ادا کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے نکتۂ ہندی کے ذائقے میں کیا لطف پیدا کیا ہے۔"

آزاد کے اس بیان پر اعتماد کر کے ہندی اور اردو کے سبھی مؤرخ خسرو کی پہیلی گوئی کا ذکر کرتے آرہے ہیں۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آزاد سے پہلے اس کا تذکرہ کس شخص نے کیا ہے۔

سطور بالا میں حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس بارے میں تفصیل کے ساتھ تحقیقی کام کا آغاز کیا جائے تاکہ ایک بڑی اور بنیادی غلطی کی اصلاح ہو سکے۔

ماخذ

نمبر	کتاب	مصنف	ناشر	سنہ
۱۔	آبِ حیات	مولانا محمد حسین آزاد	یوپی اردو اکیڈمی لکھنؤ	۱۹۸۲ء
۲۔	پہیلی نامہ	الطاف رسول دہلوی	دہلی	۱۸۷۶ء
۳۔	رسومِ ہند	آشوب وہالرائیڈ	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۶۱ء
۴۔	سعادت یار خاں رنگین	ڈاکٹر صابر علی خاں	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی	۱۹۵۶ء
۵۔	شعر کبیر (ترجمہ کبیر پداولی)	محمد انصار اللہ	علی گڑھ	۱۹۷۹ء
۶۔	عجائب القصص جلد ۱	شاہ عالم بادشاہ	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۶۵ء
۷۔	علی گڑھ تاریخ ادب اردو جلد اول	شعبۂ اردو	مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۱۹۶۲ء
۸۔	فرہنگ آصفیہ (جلد اول)	مولوی سید احمد دہلوی	ترقی اردو بورڈ، دہلی	۱۹۷۴ء
۹۔	فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی انجمن ترقی اردو کراچی	سید عارف نوشاہی	مرکز تحقیقات فارسی اسلام آباد	۱۹۸۴ء
۱۰۔	فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی موزۂ ملی کراچی	" "	" " " "	۱۹۸۳ء
۱۱۔	مقالات شیرانی جلد اول	محمود خاں شیرانی	مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۶۹ء
۱۲۔	نفس اللغۃ حصہ ۱	میر علی اوسط رشک	مدینہ پریس	
۱۳۔	ہندی ساہتیہ کا اتہاس	رامچندر شکل	ناگری پرچارنی سبھا کاشی	
۱۴۔	ہندی ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس	رام کمار ورما		۱۹۶۴ء
۱۵۔	کلیاتِ انشا		مطبع نولکشور، کانپور	۱۸۷۶ء
۱۶۔	کلیاتِ سودا (حصہ دوم)		رام نرائن لال بینی مادھو الٰہ آباد	۱۹۷۱ء
۱۷۔	رسالہ معاصر پٹنہ حصہ ۵			
۱۸۔	پندرہ روزہ ہماری زبان، علی گڑھ			۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء

●●

ڈاکٹر ایرکان ترکمان

رئیس شعبۂ اردو، سلجوق یونیورسٹی، قونیہ، ترکی

لفظ اردو کا مطلب اور تاریخی پس منظر

سنہ ۱۹۸۲ء میں جب میں چھ مہینے کے لیے ہندوستان گیا تو وہاں کے مسلمانوں کی گذارش پر میں نے "اردو پر ترکی کے تاثرات" پر تقریریں دیں جو انھیں بہت پسند آئیں۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو ترکوں اور مسلمانانِ ہند کی مشترکہ پیداوار ہے۔ ترکی النسل شاعر امیر خسرو نے اس کی بنیاد ڈالی اور ترکمان قلی قطب شاہ اور اسد اللہ خاں غالب جیسے ترک شاعروں نے اس زبان کی خدمت کر کے چار چاند لگائے۔ اس لیے ترکی ادب کی تحقیق بھی ضروری ہے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اس ادب اور زبان سے کون سے عناصر اردو میں داخل ہوئے ہیں۔ میں یہاں سب سے پہلے لفظ اردو پر ہی جو پاکستانیوں کی زبان کا نام ہے، تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔[1]

زبان ترکی کے تین بڑے مراحل ہیں: ۱۔ اسلام سے پہلے والی زبان، ۲۔ اسلام کے بعد کی زبان جو فارسی اور عربی سے بہت متاثر ہوئی، ۳۔ جدید ترکی جو ترکی کی اب رسمی زبان ہے۔ اسلام سے پہلے کی جو متون ہمیں ملتی ہیں وہ زیادہ تر بدھ مت کے بارے میں ہیں۔ دوسری متون ترکوں کے پرانے بادشاہوں کے فرمانوں کے متعلق ہیں جو آٹھویں صدی عیسوی میں لاٹھوں پر کندہ کی گئیں۔ کل تگین بادشاہ نے چینیوں کے خلاف جو متن کندہ کروائی وہ سنہ ۸۳۴ میلادی کی ہے۔ کل تگین کے کتبے ترکی زبان کے سب سے پہلے نمونے ہیں جو آج تک ملے ہیں۔ ان متون میں اردو کا لفظ ملتا ہے۔ یہاں لفظ اوردو (Ordu) کی شکل میں ہے جس کا مطلب "مرکزِ حکومت، دارالخلافہ یا چھاؤنی" تھا۔[2]

ترکوں کے مسلمان ہونے کے بعد سنہ ۱۰۶۹ء میلادی میں یوسف خاص حاجب نے ایک "قوتادغو بیلیگ" کے نام سے کتاب لکھی تھی جس کا مطلب ہے "مبارک علم یا علمِ دولت"۔ اس ضخیم کتاب میں جگہ جگہ اردو کا لفظ ہے[3] جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس صدی میں اس لفظ کے معنی یہ تھے: "محل یا شہر"۔ یوسف فرماتے ہیں "ہر شہر، ملک اور محل (اردو) میں اس کتاب کا نام دوسرا دوسرا تھا"[4] اور "کوز اردو نامی ایک شہر کے رہنے والے تھے"۔[5] ایک اور جگہ کہتے ہیں "دنیا ایک جیل خانہ ہے، اسے دل نہ دے تو بڑے محل (اردو) اور ملک

کی آرزو رکھو (یعنی جنت کی)، تاکہ آرام اور سکون ملے"[6] اور پھر کہتے ہیں "موت نے بہت سے شہر دنیا (اردو) اور ملکوں کو تباہ کر دیا۔ موت نے بہت سے گھروں کو برباد کر ڈالا"[7]۔ ترکی کے پرانے لہجے اویغوری[8] میں اردو کا لفظ "محل اور لشکرگاہ" کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا اس کا تلفظ اورتو کی شکل میں بھی تھا۔[9]

گیارہویں صدی عیسوی میں محمود کاشغری نے عربی پر ترکی کی فوقیت دکھانے کے لیے ایک لغت لکھی تھی جس کا نام "دیوان لغات الترک" ہے۔ اس میں ۷۵۰۰ کے لگ بھگ الفاظ اور اُن کے مطالب ملتے ہیں۔ لفظ اردو کے بارے میں جو کچھ اس میں لکھا ہے پیش کرتا ہوں:

اردو: "وہ شہر جس میں خاقان (بادشاہ) مقیم ہوتا ہے، اس طرح کاشغر میں کیونکہ بادشاہ رہتے تھے اس لیے اسے بھی "اردوکند" کہا جاتا تھا"۔[10]

اردو: "بالاساغون کے نزدیک ایک شہر کا نام ہے، بالاساغون شہر کو "قوز اردو" کہتے ہیں"۔

اردو بشی (Ordu Basi)۔ "وہ شخص جو خاقان کا بستر بناتا ہے"۔

کاؤرٹن صاحب اپنی لغت میں[11] ایسے ہی معنی دیتے ہوئے لکھتے ہیں "اردو (Ordu) یا اوردو (Ordo) "بادشاہ کا رہنے والا محل" "بادشاہ کا خیمہ" منگولی میں یہ لفظ اوردو (Ordo) کی شکل میں ترکی سے لیا گیا ہے۔

ہمارا یہ خیال ہے کہ جب منگولین فوج نے نظام بابا اور ترکی عسکری طرز کو اپنایا تو یہ لفظ چنگیز خاں کے بعد یعنی ۱۳ صدی عیسوی میں منگولی سے یورپ کی زبانوں میں Horde کی شکل میں جا نکلا۔ لاطینی میں Ordo۔ اور چینی میں Ao-t'ot کی شکل اختیار کی۔[12] ترکی کے چغتائی لہجے میں اردو سے مراد "قیام گاہ لشکر، لشکر، حرم سلاطین، محل" ہے۔[13]

جب ترک ایشیا سے نکل کر اناطولیہ آئے تو اپنے ساتھ وہ داستانیں بھی لائے جو وسط ایشیا کے ہیروؤں کی بہادری کی بھی کہانیاں تھیں۔ یہ کہانیاں ۱۲ صدی عیسوی کے [illegible] ہونے لگیں۔ ان میں سے سب سے مشہور داستان "دوہ قورقود" کی ہے۔[14] اس داستان میں بھی اردو [illegible] آیا ہے۔ داستان میں اردو کے معنی یہ ہیں:

اردو: "قیام گاہ لشکر، قیام گاہ سردار (بیگ)، مرکز حکومت [illegible] کا رعایا اور بگ قبیلہ سردار کا خیمہ"۔[15]

دولت عثمانیہ کے زمانے کے بعد یہ لفظ اپنے اصلی مطلب سے [illegible] نے لگا اور ترکی عثمانی کی

مشہور لغت جو شمس الدین سامی کی تصنیف ہے[16] اس میں اردو کے معنی یوں ملتے ہیں:-

اردو: "صحیح املا اوردو ہے ۱۔ عسکر، جند، جیش، لشکر، سپاہ "اردوی ہمایون = اردوِ عثمانی ۲۔ ایک ملک کے وہ حصے جو لینڈ فورس کے مطابق تقسیم کئے جاتے ہیں مثلاً "پہلی اردو، دوسری اردو وغیرہ، اردوی خامسہ = مرکزِ عساکر"۔

جدید ترکی کی سرکاری لغت میں[17] اردو کا مطلب اس طرح درج کیا گیا ہے:-

اردو: ایک ملک کی ساری فوج مثلاً "ترک اردوی" ترکوں کی فوج" ۲۔ فوج کے شعبے یا ڈویژن ۳۔ آدمیوں کا گروہ جو ایک ہی مقصد رکھتا ہو، بھیڑ ۴۔ اردوایوی = فوجی گھر (Officer's Club) ۵۔ اردوگاہ = قیام گاہ فوج (Headquarters) ۶۔ اردو بازاری = فوجی بازار، اردو بازار جو آج بھی ترکی کے ہر بڑے شہر میں موجود ہے۔ ترکی میں اردو نامی ایک شہر بھی ہے جو بحر اسود کے کنارے پر واقع ہے۔

اب یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ہند و پاک کی لغات اس لفظ کے بارے میں کیا کہتی ہیں:-

فرہنگ آصفیہ میں یہ تشریح ملتی ہے:

"اردو (ت): لشکر، فوج، کیمپ، لشکرگاہ ۲۔ لشکری بولی اور ہندوستانی وہ زبان جو عربی فارسی، ہندی، ترکی، انگریزی وغیرہ سے مل کر بنی ہے جسے اردوئے معلیٰ بھی کہتے ہیں۔ ٹھیک اور فصیح اردو، دہلی اور اہل لکھنؤ کی خیال کی جاتی ہے۔ چونکہ یہ زبان شاہجہان کے لشکر میں ایجاد ہوئی تھی اس لیے یہی نام پڑ گیا" (فرہنگ آصفیہ جلد اوّل ص ۱۴۳۔ ۱۴۴)

پاکستان کی فیروز اللغات اردو میں ذیل کی معلومات ملتی ہیں:-

اردو۔ ات۔ ۱۔ مذکر) "لشکر ۔ لشکرگاہ" ۲۔ (مؤنث) پاک و ہند کی وہ زبان جو مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ لشکری زبان" (فیروز اللغات اردو ۱۹۷۵ ص ۸۰)۔

خلاصہ یہ کہ اردو ترکی کا لفظ ہے چونکہ یہ لفظ منگولی سے یورپی زبانوں میں داخل ہوا ہے تو یورپ والے اس کو منگولین لفظ سمجھتے ہیں۔ جب شاہجہان نے دہلی میں اردوئے معلیٰ (اردوی ہمایون) کو تنظیم کیا تو شائستہ ہندوستانی اور ترکی سپاہیوں کی مشترکہ زبان یہی زبان ہوئی جس کا نام اردو ہو کر رہ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ریختہ کی بنیاد ترکوں، ہندوستانی اور فارسی گو افغانوں کی طرف سے بہت پہلے ڈالی گئی تھی۔

اب نتیجہ کے طور پر لفظ اردو کا پورا مطلب یوں نکلتا ہے:

۱۔ مرکزِ حکومت، دارالخلافہ یا چھاؤنی۔ ۲۔ بادشاہ کا محل یا وہ شہر یا خیمہ جہاں بادشاہ مقیم ہوتا ہے[۸]۔ ۳۔ لشکرگاہ۔ ۴۔ لشکر حرم محل سلاطین۔ ۵۔ سردار (بیگ) کی رعایا یا اُس کا ملک۔ ۶۔ لشکر، ملک کی ساری فوج (Army)

کتابیات

۱۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے میرا مضمون:

Erkan Türkmen, The Turkish Elements in Urdu, The Journal of Ottoman Studies, VI, Istanbul p. 1- 30.

2- Hüseyin Namik Orkun, Eski Türk Yazitları (ترکی زبان کے پرانے کتبے) TDK, 1987, p. 50

3- Yusuf Has Hajib, Kutadgu Bilig(Index), Rashid Rahmeti Arat, Türk Kültürü Araştırmaları Institüsü, Istanbul 1979, p.345.

4- Kutadgu Bilig(Metin= the Text), TDK, p.6

5- Ibid p. 9

6- Ibid p. 316

7- Ibid p. 483

8- یہ بولی وسط ایشیا میں ۸ ویں صدی عیسوی میں استعمال ہوتی تھی۔

9- A.Jaferoglu, Eiske Uygur Türkçesi Sözlügü (پرانی اویغور ترکی لغت) TDK, Ankara 1968 p. 142.

10- Kashgarli Mahmud, Besim Atalay, Divan-u Lugat-it-Türk, TDK, Ankara Vol. I, p. 124.

11- Sir Gerard Clauson, An Etymological Dictionary of Pre-Thirteenth Century Turkish, Oxford, 1972 p. 203.

12- Ibrahim Kafesoglu, Turk Milli Kulturu, Ankara 1977 p. 231.

13- یاد رہے کہ ہندوستان کے مقیم ترکان وسط ایشیا فارسی ہی بولتے تھے جسے تورانی فارسی کہا جاتا تھا۔

14- ردو وہی لفظ ہے جس کو اردو میں داوہ کہتے ہیں۔

15- Muharrem Ergin. [illegible]de Korkut Kitabi, Ebru Yayinlari, Istanbul 1986, p. [illegible]63.

16- قاموس ترکی، ش. سامی، درسعادت، استنبول ص ۹۸۔

17- Türkçe Sözlük, [illegible], Ankara 1983, p. 903.

18- Radloff. Versuch [illegible]ines Wörterbuches der Türk-Dialecte, 1960, vol. I p. [illegible]072.

Note: TDK = Turkish [illegible]public, Board of the Turkish Language, Ankara.

ڈاکٹر رضوان الدین خاں
شعبۂ انگریزی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۱)

اللباب هدية للاصحاب

(نسخۂ خدابخش)

ثناء اللہ پانی پتی پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھنے کے دوران مجھے مرزا صاحب کے خطوط کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوا کہ قاضی صاحب نے مرزا صاحب کی فرمائش پر محمد بن یوسف الصالحی (م ۹۴۲ھ) کی کتاب "سبیل الهدیٰ والرشاد فی سیر خیر العباد" کی تیسری جلد کا خلاصہ تیار کیا ہے۔ لیکن کہیں اس کی موجودگی کا علم نہ ہو پایا تھا۔ اب چھ سات سال پہلے ہندوستان میں علم حدیث سے متعلق ایک کتاب نظر سے گذری جس میں "اللباب" کے نام سے اسی خلاصہ کا ذکر تھا اور خدا بخش لائبریری، پٹنہ کے مطبوعہ کیٹلاگ کا حوالہ دیا ہوا تھا۔ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری میں مذکورہ کیٹلاگ دیکھا اور مخطوطہ دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اب کتاب دیکھنے کا موقع ملا تو اس کے بارے میں چند باتیں عرض ہیں:۔

اس کتاب کا موضوع سیرتِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق، عادات، عبادات، معاملات، معاشرت، ادعیہ، اذکار، اقضیہ، فتاوی، ھدیہ وغیرہ کا بیان احادیث کے الفاظ میں ہے۔ قاضی صاحب نے احادیث کو مختصر کر کے پیش کیا ہے اور علاوہ حذفِ اسناد کے متنِ حدیث میں سے بھی صرف ضروری حصہ لیا ہے۔ اور تعارض کی شکل میں اپنی تاویلات کے ساتھ تطابق پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ہر حدیث کے بعد قاضی صاحب نے علامتی حوالہ جات بھی دیے ہیں، مثلاً صحیح بخاری کے لیے "خ" صحیح مسلم کے لیے

۴۔ اور کہیں کہیں محدثین کے پورے نام بھی درج ہیں۔ اس طرح بیس سے زیادہ کتب احادیث کے حوالے اس کتاب میں ملتے ہیں۔ یہ نسخہ قاضی صاحب کی حیات ہی میں ان کے اصل مسودہ سے ۱۱۹۸ھ میں عبدالباقی نے نقل کیا ہے۔

یہ کتاب دراصل محمد بن یوسف الصالحی (م ۹۴۲ھ) کی کتاب "سبل الہدیٰ والرشاد فی سیر خیر العباد" کی تیسری جلد کی تلخیص ہے، جس کو قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ) نے اپنے پیر و مرشد مرزا مظہر جانجاناں (م ۱۱۹۵ھ) کی فرمائش پر تیار کیا تھا۔

شمس الدین، ابو عبداللہ، محمد بن یوسف بن علی بن یوسف، الشامی، الصالحی، الدمشقی، الشافعی اپنے دور کے زبردست عالم، محدث، حافظ اور مورخ گزرے ہیں۔ دمشق کے قصبہ "صالحیہ" میں پیدا ہوئے تھے۔ قاہرہ کے صحرا میں واقع "برقوقیہ" میں سکونت اختیار کی اور وہیں ۱۴ شعبان ۹۴۲ھ/۱۵۳۶ء میں وفات پائی۔[1]

علامہ الصالحی کی چودہ تصانیف کا اب تک علم ہو سکا ہے جن میں سے ایک "سبل الہدیٰ والرشاد فی سیر خیر العباد" ہے جو مخطوطہ کی شکل میں چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ "السیرة الشامیہ" کے نام سے بھی یہ کتاب جانی جاتی ہے۔ متاخرین کی کتابوں میں "سیرة النبی" (صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ سب سے اچھی کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ اس کی تیاری میں تین سو سے زیادہ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ابتدا "الحمد للہ الذی جعل العلماء ورثة الانبیاء" کے الفاظ سے ہوتی ہے۔ یہ کتاب ۱۵۱۹ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے صرف تیسری جلد میں ۴۱۲ ابواب تھا۔ اس کتاب کی تالیف کا کام ۹۲۹ھ میں مکمل ہوا۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۱۴۳ھ۔۱۲۲۵ھ) اپنے دور کے ایک [illegible]ست عالم، فاضل، فقیہ، متکلم، محدث، مفسر، حافظ قرآن، عابد و زاہد اور باکمال شخص تھے۔ ان کے پیر [illegible] مرزا مظہر جانجاناں (۱۱۱۱ھ۔۱۱۹۵ھ) ان کو "علم الہدیٰ" کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے اور شاہ عبدالعزیز (۱۱۵۹ھ۔۱۲۳۹ھ) [illegible] بیہقی وقت" کہا کرتے تھے۔

۱۔ الزرکلی، الاعلام ۷: ۲۰-۲۱؛ عمر رضا کحالہ، معجم المؤلفین ۱۲: ۱۵۵

قاضی صاحب پانی پت ہی میں عہدہ قضاۃ پر فائز رہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد تقریباً پچاس ہے۔ پہلے وہ شیخ محمد عابد سنامی (م ۱۱۶۰ھ) سے سلسلہ چشتیہ میں بیعت ہوئے تھے، پھر سلسلہ نقشبندی میں حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے دستِ مبارک پر بیعت ہوئے اور بہت جلد تمام منازل سلوک طے کرلیں۔ سلسلہ نقشبندیہ میں بدعات سے اجتناب اور اتباع سنت نبویہ پر بہت زور رہا ہے۔ اس سلسلہ کے بزرگان اپنے ہر ہر عمل کو سیرت کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور قرآن و سنت کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ یہی داعیہ تھا جو "اللباب" کا محرک بنا۔

ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ کی جلد ۲۲ نمبر ۶ جون ۱۹۲۹ء کے صفحات ۴۴۲ تا ۴۵۰ پر "سلسلہ عالیہ مجددیہ اور علم حدیث" کے عنوان سے مولانا محمد فاروق بہرائچی کا مضمون شایع ہوا تھا جس میں لکھا ہے کہ:

"حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضور اقدس و انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر ایک رسالہ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ اسے آپ نے لکھ کر حضرت مرزا صاحب کی خدمت اقدس میں بھیج دیا تھا مگر وہ آپ کے حسب دلخواہ نہ تھا۔ اس لئے آپ نے قاضی صاحب کے پاس اسے بھیجا اور چند کتابیں اور بھیجکر لکھا کہ اپنے علم کے مطابق ایک کتاب سیرتِ میں لکھو۔"

اس بیان کی کسی قدر تصدیق، قاضی صاحب کے نام، مرزا صاحب کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے، جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ:

"در رسالہ متن خلاصۃ السیرۃ ترجمہ آنکہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ نوشتہ اند، ہر دو پیش فقیر بود، بدست فقیر اللہ مرسل شدہ خواہد رسانید"[1]

"سبل الہدیٰ والرشاد" کا ایک نسخہ قاضی صاحب کی اپنی ذاتی لائبریری میں موجود تھا جس سے مرزا صاحب بھی استفادہ کیا کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ فارسی میں اس کا خلاصہ تیار ہو جائے۔ چنانچہ ایک بار انھوں نے قاضی صاحب کو لکھا:

"و جلد ثالث سبل الرشاد، مملوک شما، اینجا بعاریت است۔ وقت ملاقات حوالہ نمودہ میشود، بشرط آنکہ انتخاب بعضی ابواب آں بزبان فارسی بر داشتہ شود"

۱۔ عبدالرزاق قریشی (مرتب)، مکاتیب مرزا مظہر، علوی بک ڈپو، بمبئی، ۱۹۶۶ء، مکتوب ۱۱۲، ص ۱۲۷

بدید کہ اتباع سنت را بہ ازیں وسیلہ نیست"[1]

سببِ تالیف کے ان خارجی شواہد کے علاوہ داخلی طور پر خود کتاب "اللباب" کے مقدمے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں:

" فامرنی شیخی وامامی مرشد العالمین ... قطب ارشاد حضرت مرزا جانجاناں ...
ان الخص ذلک المجلد الثالث بحیث لایفوت مقصود من کل باب[2]"

"اللباب" کے خطبۃ الکتاب کے الفاظ یہ ہیں:

" الحمد للہ الذی ھدانا سبیل الرشاد ورزقنا زاد المعاد وامننا من تغییر البلاد۔ والصلوۃ والسلام علی خیر العباد الناطق بالحق وبما یصلح الفواد المرسل الی العالمین بالدین القویم وطریق السداد۔ وعلی آلہ واصحابہ الذین سلکوا مناھج الحق وھدوا اخیر السھاد، ازالوا ظلمۃ الشرک والفساد۔ وعلی من اتبعھم بالاحسان الی یوم التناد"۔

حمد و صلوۃ کے بعد قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے کتاب کے مقدمے میں جو کچھ بیان کیا ہے اس کی ملخص ترجمانی یوں کی جا سکتی ہے کہ:

" اس عالم کون و فساد میں کمال بشریت کی انتہا یہی ہے کہ آدمی، اخلاق و اعمال اور اعتقاد سے متعلق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کی سنت کی ایسی کامل اتباع کرے کہ حسب وعدہ الٰہی، وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ بن جائے اور اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کی آگ سے بچا لے اور اس کے درجات بلند فرمائے اور اس کو مقام قرب عطا فرمائے"۔

یہ سب کچھ اس بات پر موقوف ہے کہ زندگی کے ہر معاملے سے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، کا طریقہ معلوم ہو۔ اس موضوع پر متعدد کتابیں تصنیف و تالیف ہوئی ہیں، جیسے:۔ "زاد المعاد" اور "سبل الرشاد" وغیرہ۔ "سبل الرشاد" علامہ محمد بن یوسف الصالحی الشافعی کی کتاب ہے جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تیسری جلد میں آنحضرت ؐ کے اخلاق، عادات شریفہ، عبادات، معاملات، معاشرت، ادعیہ اذکار [illegible] اور حلیہ وغیرہ کا ذکر ہے۔

قاضی صاحب لکھتے ہیں: میرے پیر و مرشد حضرت مرزا مظہر جانجاناں نے مجھے حکم دیا کہ میں اس تیسری

1۔ عبدالرزاق قریشی (مرتب): مکاتیب مرزا مظہر، مکتوب ۸۳، ص ۱۴۲۔ 2۔ کتاب [illegible]، ورق ۱ (ب)

جلد کی اس طرح تلخیص کروں کہ اس کے کسی باب کا کوئی مقصد فوت نہ ہو۔ چنانچہ میں نے اس کو مختصر کیا اور کتاب میں مذکورہ صحابہ کرام کے سلسلہ روایت کو ترک کیا نیز بخوف طوالت زائد اقوال کو چھوڑا اور اگر کسی مقام پر ایک ہی مفہوم کی دو یا دو سے زیادہ احادیث وارد ہوئیں تو ان میں سے جو سب سے زیادہ صحیح ہے اس کو لکھا اور باقی کو اختصار کے پیش نظر حذف کر دیا۔ مراجع و مصادر کیلئے یہ علامات مقرر کی ہیں: صحیح بخاری کے لیے 'خ'، صحیح مسلم کے لیے 'م'، متفق علیہ کے لیے 'ق'، سنن ابوداؤد کے لیے 'د'، سنن نسائی کے لیے 'س'، سنن ابن ماجہ القزوینی کے لیے 'جہ'، مالک کے لیے 'ک'، شافعی کے لیے 'فع' اور بعض جگہ شافعی کے لیے 'ش'، احمد کے لیے 'ا'، حاکم کے لئے 'کم'، طبرانی کے لیے 'طب'، دارمی کے لیے 'می'، دارقطنی کے لیے 'قط'، ابن عساکر کے لیے 'کر'، ابن حبان کے لئے 'حب'، ابن خزیمہ کے لیے 'یمہ'، ابن ابی شیبہ کے لیے 'شیبہ'، بخاری فی الادب کے لیے 'خد'، ابن مردویہ کے لیے 'مر'، ابن المنذر کے لیے 'منذ'، بیہقی کے لیے 'قی'، بزار کے لیے 'ز'، ابویعلی کے لیے 'یع'، ابن عدی کے لیے 'عد'، ابونعیم کیلئے 'نعیم'، عبد بن حمید کے لیے 'عبد'، ابوالشیخ کے لیے 'شیخ'، ابن سعد کے لیے 'سعد'، ابن ابی الدنیا کے لیے 'دنیا'، اور ان کے علاوہ باقی کتابوں کے پورے نام لکھے ہیں۔ جہاں کہیں ضمیر غائب بلا مرجع آئی ہے اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پس اللہ تعالی کی حمد اور اس کی حسن توفیق کے ساتھ یہ مختصر کتاب، جس کا نام "اللباب ہدیۃ للاصحاب" ہے شروع ہوتی ہے۔ اللہ ہی راہ راست پر چلانے والا ہے، اسی پر بھروسہ اور اعتماد ہے۔

"سبل الہدیٰ" کی تیسری جلد ۲۱۲ ابواب پر مشتمل ہے اور "اللباب" میں ۱۸۱ ابواب ہیں۔ سبل الہدیٰ کے شروع میں ۱۰۴ ابواب "بعض الوفود الیہ صلی اللہ علیہ وسلم" میں سے قاضی صاحب نے کچھ نہیں لیا ہے۔ اور متعدد ابواب کو مختصر کر کے ایک باب میں ضم کر دیا ہے۔ جیسا کہ مقدمہ کی ترجمانی سے ظاہر ہو گیا ہے کہ یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کی سیرت پاک پر ہے۔ لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ اس کی زبان مصنف کی اپنی نہیں ہے بلکہ پوری کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بیانات پر مشتمل ہے۔ گویا یہ سیرت بالملفوظ یا سیرت بالماثور ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، کی سوانح حیات کو احادیث نبویہ کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ قاضی صاحب نے احادیث کو مختصر کر کے پیش کیا ہے اور علاوہ حذف اسناد کے، متن حدیث میں سے بھی صرف ضروری حصہ لیا ہے۔ اختلاف روایات کی تطبیق اور راجح مذہب کی ترجیح کے وجوہ بھی ایسے مجتہدانہ انداز سے درج کئے ہیں کہ ان کی خوبیوں کا صحیح اندازہ ماہرین حدیث ہی کر سکتے ہیں۔

نمونے کے طور پر اس کتاب کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

باب فی وفور عقلہ، صلی اللہ علیہ وسلم۔

روی داؤد بن سیرین افضل الناس اعقل الناس قال وذلک نبیکم، صلی اللہ علیہ وسلم۔ (ورق ۲ ب)

باب فی ترحیبہ، صلی اللہ علیہ وسلم

صوت عمار فقال: "مرحبا بالطیب المطیب"۔ خد

اقبلت فاطمۃ فقال: "مرحبا" وقد تکلم بغیر العربیۃ، اخذ الحسن بن علی تمرۃ من الصدقۃ، فقال: کخ کخ القھا۔ اما تعرف انا لا ناکل الصدقۃ"۔ خ (ورق ۱۶ ب)

کتاب کے آخر میں باب "فی الصمت وعدم مواجھتہ احدا بما یکرہ وھو فی ذلک من سیرتہ" ہے جو ۱۶ حدیثوں پر مشتمل ہے اور سب سے آخری حدیث یہ ہے:

"عن نافع سمع ابن عمر زمارۃ راع فوضع اصبعیہ فی اذنیہ وعدل براحلتہ عن الطریق وھو یقول: یا نافع اتسمع ما یقول؟ فیمضی حتی قلت: لا فوضع یدیہ واعاد راحلتہ الی الطریق۔ وقال: رایت رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم، سمع زمارۃ راع فقال مثل ھذا۔ اد۔ قال نافع کنت اذ ذاک صغیرا۔ اد" (ورق ۱۶۸ ب)

اس کے بعد حمد وصلوٰۃ: "الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین" پر کتاب کا اختتام ہوتا ہے۔ جس کے بعد کاتب نے یہ ترقیمہ [illegible]ا ہے:

"تمت ھذہ النسخۃ الشریفۃ فی الخامس وعشرین الصفر المظفر سنۃ الثامن وتسعین والمائۃ بعد الالف بیدہ العاصی عبد الباقی غفر اللہ ذ[illegible] وستر عیوبہ۔ نقل من اصل المسودۃ بخط المولف القاضی ثناء اللہ سلمہ اللہ بالارش[illegible] التکمیل۔ اللھم آمنا فوائدہ لاولادنا ولسائر الطالبین فی یوم الاثنین عند حول الش[illegible] الزوال بعون الفضل اللہ المتعال"۔

یہ کتاب ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی ہے بلکہ [illegible] کی شکل میں ۲۸۷۷ نمبر پر خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں موجود ہے جہاں اس کی بہت عمدہ جلد [illegible] کرا کر محفوظ کیا گیا ہے اور

ہر خاص و عام کے مطالعے کے لئے دستیاب ہے۔ راقم الحروف اس کتاب کو تحقیق و تعلیق اور ترجمہ و تصحیح کے ساتھ جلد زیرِ ترتیب دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ خدا بخش لائبریری میں محفوظ یہ نسخہ، قاضی صاحب کی حیات ہی میں ان کے اصل مسودے سے ۱۱۹۸ھ میں عبدالباقی کا نقل کیا ہوا ہے۔ اس کی کسی دوسری نقل کا ابھی تک علم نہیں ہو سکا ہے۔ البتہ اصل نسخہ بہرائچ میں حافظ اعزاز الحق کے پاس موجود ہے جو ۶"×۱۰" سائز کے ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ میں ۲۰ سطریں ہیں۔ اس کا ابتدائی حصہ خستہ حالت میں ہے۔ اور آخر میں باب التفسیر میں سورہ انفال کے بعد سے تمام اوراق ایک دوسرے سے چسپاں ہیں۔ جس طرح نقل کردہ نسخے کے سرورق پر کسی نے کتاب کا نام "لباب الحدیث" لکھ چھوڑا ہے اُسی طرح اصل نسخہ کے سرورق پر کتاب کا نام "حدیث مظہری" لکھا ہوا ہے۔

شاہ نعیم اللہ بہرائچی بھی حضرت مرزا مظہر جانجاناں کے خلفا میں سے تھے اور قاضی صاحب سے بہت متاثر تھے۔ مرزا صاحب کی شہادت کے بعد شاہ صاحب نے قاضی صاحب سے استفادہ باطنی بھی کیا تھا۔ اور کافی طویل مدت تک قاضی صاحب کی خدمت میں پانی پت رہے تھے۔ یہ کتاب، قاضی صاحب کے چند خطوط اور مرزا صاحب کے چند تبرکات، مثلاً مرزا صاحب کا چشمہ، ٹوپی، عبا وغیرہ اور مرزا صاحب کی چارپائی کے خون آلود بان، یہ سب چیزیں شاہ نعیم اللہ صاحب کے پاس بہرائچ میں تھیں جو ان کے وارثین میں اب تک محفوظ ہیں۔ شاہ صاحب کے ذخیرہ میں سے ان کی ایک تصنیف "بشارات مظہریہ" پُراسرار طریقے پر غائب ہو گئی تھی اور برٹش میوزیم، لندن پہنچ گئی تھی۔ جب سے ان کے ورثا بہت زیادہ محتاط ہو گئے ہیں اور آسانی سے کوئی کتاب یا تبرکات نہیں دکھاتے ہیں۔

(۲)

مظہر جانجاں کے بارے میں

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا ایک قطعہ

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اپنی عربی کتاب "اللباب ہدیۃ للاصحاب" کے خطبۃ الکتاب میں [illegible] مرزا مظہر جانجاناں کے بارے میں یہ فارسی قطعہ لکھا ہے جس سے مرزا مظہر جانجاناں کے نام، لقب اور عرف عام وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کتاب کا واحد مخطوطہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔

نام او بر زبان زبی ادبیست گرچہ جان و دلم بدان گویاست

لیک او لیست ذکر او بر زبان چون زبان ہم سادق جویاست

قطب ارشاد حضرت مرزا جانجاناں کہ در جہاں یکتاست

شمس دین است ہم حبیب اللہ مظہر او را تخلص شعر است

در نسب از نبایر حیدر در حسب قبلہ گاہ اہل صفاست

مظہر نسبت مجدد دین محیی سنت رسول خداست

ظاہر آراستہ بشرع نبی باطن او بنور حق بیناست

قد افلاک در تواضع خم پیش او زانکہ [illegible]و بذکر خداست

گر کسی وصف او زمن پرسد گویم از وہم و فہم من بالاست

خالق جان و تن ہمیشہ ید زمرۂ اولیاء تحت قباست

بی نشانست [illegible]چہ از گل والاست

ہر کہ یابی نشان شود دمساز تا ابد گرچہ [illegible] انشاست

بیدل از بی نشان چگوید بار گرچہ نامی ز [illegible]قان پیداست

عاشقان کشتگان معشوق اند وصف او را [illegible] او داناست

پس دریں باب بہتر است سکوت خاصۃ تا کہ [illegible] ئی ماست

خلدہ اللہ ظلالہ ابداً

جناب عبید محمد الانصاری
شعبۂ اردو، بہار یونیورسٹی مظفرپور

مکتوبات احمد سرہندی کا احمد منیری سے غلط انتساب

شیخ احمد سرہندی (= مجدد الف ثانی) سرہند (= سہرند) میں ۱۵۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ عبدالاحد اہل علم بزرگ تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے۔ طریقہ نقشبندی میں آپ کی ارادت خواجہ باقی باللہ دہلوی سے تھی۔ ابتدائی عمر ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور سترہ سال کی عمر میں تمام علوم دینی سے فارغ ہو گئے۔ بعد ازاں آگرہ تشریف لے گئے جہاں آپ کی ملاقات ابوالفضل اور فیضی سے ہوئی۔ یہیں آپ کو اکبر کے دین الٰہی سے آگاہی ہوئی۔ آپ نے دہلی آ کر اس کے خلاف جدوجہد کی جس کے باعث عتاب شاہی کا نشانہ بنے۔ جہانگیر سے بھی شروع میں مخالفت رہی اور اس نے کچھ عرصے تک آپ کو قلعہ گوالیار میں قید رکھا تاہم بعد میں کچھ صفائی ہو گئی۔ آپ کا انتقال ۱۶۲۴ء میں ہوا۔

آپ کی تصانیف میں آپ کے مکتوبات مشہور ہیں۔

شرف الدین احمد ابن یحییٰ منیری (= مخدوم صاحب) کی ولادت ۶۳-۱۲۶۲ء میں بمقام منیر (ضلع پٹنہ) ہوئی۔ علوم متداولہ کی تحصیل مولانا شرف الدین ابو توامہ (سنار گاؤں) سے کی۔ اس کے بعد دہلی پہنچ کر

خواجہ نجیب الدین کے مرید ہوئے۔ ۸۱-۱۳۸۰ء میں وفات پائی۔

آپ کی متعدد تصانیف میں مکتوبات خاص شہرت کے حامل ہیں۔

حضرت مخدوم جہاںؒ کے مکتوبات تین حصے ہیں جو عام طور پر مکتوبات صدی، مکتوبات دو صدی اور مکتوبات بست وہشت کے نام سے مشہور ہیں۔ لیکن صاحب بزم صوفیہ صباح الدین عبدالرحمٰن نے مخدوم جہاں کے مکاتیب کے ایک اور مجموعہ کا ذکر کر کے محققین کے لیے مزید پریشانی کا اضافہ کر دیا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"انڈیا آفس لائبریری میں حضرت مخدوم جہاں کے مکتوبات کا ایک اور مجموعہ ہے اس میں خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم کے نام خطوط ہیں۔ ان دونوں کو حضرت مخدوم الملک فرزند کہہ کر مخاطب فرماتے ہیں، جس سے انڈیا آفس کیٹلاگ کے مرتب کو دھوکہ ہوا ہے کہ وہ دونوں حضرات مخدوم الملک کے صاحب زادے ہیں۔"

مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں آج تک جو لوگ حضرت مخدوم جہاں کی تصانیف اور ان کے کارناموں پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس مجموعہ کا ضرور ذکر کرتے ہیں۔

حسن اتفاق کہ اس کی فوٹو کاپی خدا بخش خاں لائبریری میں آ گئی ہے، اور وہ مکتوبات صدی فوٹو اسٹیٹ کاپی کے نام سے موسوم ہے اور ہینڈ لسٹ ۲۵۱ ہے۔ اس کا جب میں نے مطالعہ کیا تو پایا کہ یہ حضرت مخدوم جہاںؒ کے مکتوبات نہیں ہیں۔ وہ کیسے؟

میری تحقیق سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں جو پیش خدمت ہیں:

۱۔ ان مکتوبات میں جن لوگوں کے نام خطوط ہیں ان کا تعلق کبھی مخدوم صاحب سے نہیں رہا۔ مثلاً اکثر خطوط خواجہ محمد معصوم، خواجہ محمد سعید، میر محمد نعمان، میر محب اللہ، ملا مقصود علی تبریزی، قاضی نصر اللہ وغیرہم کے نام ہیں جبکہ ان لوگوں کا تعلق مخدوم صاحب سے بالکل نہیں ہے۔ ا[illegible] مخدوم صاحب کے دور سے تعلق رکھتے تھے۔

۲۔ خواجہ محمد معصوم اور خواجہ محمد سعید کو فرزند کہہ کر مخاطب [illegible]تے ہیں، جبکہ یہ دونوں ان کے فرزند نہیں ہیں۔

۳۔ یہ مکتوبات المکتوبات پنجم سے شروع ہوتے ہیں۔ اس اعتبار [illegible] ب اس میں ۴ مکاتیب کی کمی رہ گئی جبکہ صاحب بزم صوفیہ نے انڈیا آفس کا حوالہ دے کر کہا ہے کہ اس [illegible] ۱۲۵ خطوط ہیں۔ عجب کہ اس میں کل ۱۲۱ مکتوبات ہیں۔

۴۔ مخدوم جہاںؒ نے اپنی تصانیف میں کسی جگہ بھی لفظ "اخوی" کا استعمال نہیں کیا ہے۔ بلکہ ہر جگہ "برادرم" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مثلاً برادرم خواجہ مظفر، برادرم شمس الدین وغیرہ لیکن ان مکتوبات میں ہر جگہ لفظ "اخوی" کا استعمال ہوا ہے "برادرم" کا نہیں۔

۵۔ یہ نسخہ یوں شروع ہوتا ہے:

"مکتوب دوازدہم، بخدمت پناہ میر محمد نعمان، در فوائد مزرع۔"

آغاز:۔ الحمد اللہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ، اما بعد!

لیکن مخدوم جہاںؒ کے مکتوبات یوں شروع ہوتے ہیں:

"مکتوب صد و پنجاہ و ہفتم۔ در تحصیل علم زیادت از حاجت

آغاز:۔ امام تاج الدین سلام و دعا از کاتب حروف شمس منیری مطالعہ کند۔

ان نکات سے معلوم ہوا کہ یہ حضرت مخدوم جہاںؒ کے مکتوبات نہیں ہیں۔

لیکن پھر ایسی غلطی صاحب بزم صوفیہ سے کیوں ہوئی! اس کی تفتیش جب میں نے کی تو پتہ چلا کہ کیٹلاگ کے مرتب کو دھوکا ہوا ہے۔ جس کا اعتراف خود صاحب بزم صوفیہ نے بھی کیا ہے کہ خواجہ محمد معصوم اور خواجہ محمد سعید کو مخدوم الملک فرزند کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، حالانکہ دونوں ان کے فرزند نہیں ہیں۔

چونکہ اس مجموعے کے شروع اور آخر کے حصے غائب ہیں، کیٹلاگ کے مرتب کو پتہ لگانا تھا کہ آخر یہ کس کے خطوط ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ورق گردانی شروع کی اور جب ان کی نظر اس نسخہ کے صفحہ ۵۲ پر پڑی تو اسی سے اندازہ لگایا کہ یہ خطوط حضرت مخدوم صاحب کے ہیں۔ وہ عبارت یہ ہے:

"مکتوب سی و سوم بملا شمس ورود یافتہ۔ در بیان تحقیق این سخن شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کہ گفتہ تا کافر نشود مسلمان نشود۔ و سر برادر نبرد و ہما در خود جفت نشود مسلمان نشود ملا شمس باستقامت باشید۔ پرسیدہ بود کہ شیخ المشائخ شیخ شرف الدین یحییٰ منیری قدس سرہ در رسالہ ارشاد السالکین نوشتہ اند کہ تا کافر نشود مسلمان نشود الخ"

اس عبارت میں شیخ مخدوم جہاںؒ کا نام آیا اور اس سے اندازہ لگالیا کہ یہ مکتوبات، مخدوم احمد منیری کے ہیں، چنانچہ انڈیا آفس کے کیٹلاگ کے مرتب نے اس قلمی نسخہ پر لکھ دیا: "مکتوبات احمد منیریؒ (اتھو ولکشن)" اسی حوالہ کے تحت صاحب بزم صوفیہ نے اپنی کتاب میں مخدوم جہاںؒ کے اس ایک اور مجموعہ کا ذکر کیا اور اسی کا بنا

پر آج تک سب اسی غلط فہمی میں ہیں کہ مخدوم جہاںؒ کے مکتوبات صدی، مکتوبات دوصدی اور مکتوبات بست وهشت کے علاوہ ایک اور مجموعہ ہے جو ۱۲۵ خطوط پر مشتمل ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ مکتوبات حضرت مخدوم جہاںؒ کے نہیں ہیں تو پھر کس کے ہیں؟

تو جب میں نے مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کا مطالعہ کیا تو حیرت زدہ رہ گیا کہ یہ تمام خطوط حضرت مجدد الف ثانیؒ شیخ سرہندی کے ہیں۔ اور یہ قلمی بھی نہیں ہیں بلکہ نول کشور پریس سے چھپ چکے ہیں۔ اور ہر جگہ دستیاب ہیں اور مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی تیسری جلد سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً:

مکتوب چہارم سے یہ قلمی مجموعہ شروع ہوتا ہے۔ مکتوب چہارم سے لیکر ۱۲۵ مکتوبات تک جن لوگوں کے نام خطوط ہیں وہ ٹھیک اسی ترتیب سے چھپے ہوئے نسخہ میں موجود ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ کیٹلاگ کے مرتب کو جو دھوکا ہوا وہ اس مجموعہ کے مکتوب سی وسوم "بملا شمس درود یافتہ در بیان تحقیق این سخن شیخ شرف الدین احمد منیری کہ گفتہ تا کافر نشود الخ" والی عبارت دیکھ کر ہوا۔

یہ عبارت مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے جلد سوم میں ٹھیک اسی طرح سے جو صفحہ ۷۱ سے شروع ہوتی ہے اور پوری جلد ۲۴۷ صفحات پر مشتمل ہیں موجود ہے۔

مذکورہ بالا تحقیقات کی روشنی میں یہ بات مجھے کہنے میں اب قطعی جھجک محسوس نہیں ہوتی ہے کہ یہ مکتوبات مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیریؒ کے نہیں ہیں بلکہ یہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ سرہندیؒ کے ہیں

۞ ۞

جناب کلب علی خاں فائق رامپوری

آر-۳۲۲ ماڈل ٹاؤن لاہور-۱۴ (پاکستان)

تصحیح و اضافہ

تذکرۂ کاملانِ رامپور

(۱)

سیّد ابدال شاہ: ص ۱ امیر خاں والی ٹونک کا عہد بہت بعد کا ہے۔ زبانی روایت معتبر نہیں۔ یا جزو اول علی محمد خاں کی روایت غلط ہو گی۔ علی محمد خاں متوفی ۱۱۶۲ھ ہیں غالباً بعہد فیض اللہ خاں آئے ہوں گے جو ۱۱۸۰ھ–۱۲۰۸ھ ہے۔

حکیم ابو علی خاں: ص ۶ حکیم ابو علی خاں کے بیٹے کا ذکر غالباً آثار الصنادید یا مجموعہ نغز میں دیکھا ہے غالباً ۱۲۳۰ھ سے قبل فوت ہوئے۔

مولوی احسان حسین: ص ۷ سجاد حسین چیف مجسٹریٹی میں ہیڈ کانسٹبل کی حیثیت سے پولیس کے کاغذات پیش کرتے تھے۔ وکالت کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ بعد میں وکالت کرنے لگے۔ ان کے دو بیٹے ہیں، ایک کا نام عابد حسین ہے جو کراچی میں آ گیا۔ دوسرے بیٹے رام پور میں ہیں جن سے ۱۹۶۲ء میں رام پور میں ملاقات ہوئی تھی

سجاد حسین کے چھوٹے بھائی جواد حسین عدالت دیوانی میں اہلکار تھے۔ اب غالباً رام پور میں ہیں۔

ص ۸ س ۶ مصحفی کو مصحفی لکھا گیا ہے، جو غلط ہے۔

اخوندزادہ احمد خاں تخلّص غفلت: ص ۸ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی ان کا ایک قلمی دیوان ہے۔

حکیم احمد رضا خاں لکھنوی: ص ۱۲ سرور قیصری اور مذاق کا پتلا ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئے تھے۔ حافظ محمود رضا خاں عرف جانی کے فرزند حکیم محسن رضا خاں اور مشتاق رضا خاں ہیڈ پولیس تھے۔

شاہ احمد سعید مجددی: ص ۱۵ شاہ ابو سعید ۱۲۴۹ھ میں نہیں بلکہ ۱۲۵۰ھ میں حج کر گئے۔ نو سال مدت صحیح نہیں۔

میاں احمد علی شاہ تخلص احمد: ص ۲۶ مصری صاحب کا گھر ہے جس میں مزار ہے۔ بقول مولوی وحید الدین

صاحب نظام کا مکان تھیں۔ دفن اپنے مکان میں ہوئے۔ حاجی تمیز علی تمیز تو مسلم تھے۔ مولوی وزیر محمد خاں والد خاں تھا
خاں کی وفات ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۵ء میں ہوئی۔

حکیم احمد علی انصاری: ص ۲۶ حکیم کبیر علی خاں کا تخلص کبیر بھی تھا اور حسرت بھی، اور وہ قائم کے شاگرد تھے اور حکیم علوی خاں کے طب میں شاگرد تھے۔ ان کے بیٹے منیر علی خاں کا تخلص مروت تھا۔ ان کا قلمی دیوان بقول قاضی عبدالودود کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے۔ اور یہ سودا کے معاصر ہیں۔ حکیم احمد علی خاں حکیم کبیر علی کے بھائی تھے۔

مولوی حافظ احمد کبیر مجددی: ص ۲۹ یہ مصنف اور مرتب بھی تھے۔ قیام کلکتہ کے زمانہ میں انہوں نے بعض کتابیں مرتب کی تھیں۔

ص ۲۵ مولوی مرشد علی، مدرس درجہ ہفتم عربی مدرسہ عالیہ رام پور (۱۹۲۱ء کے آس پاس)

مولوی اسحاق خان: ص ۲۶ بہادر شاہ ظفر تالیف رئیس احمد جعفری میں حالات ہیں۔

ص ۲۸ ۱۲۱۱ھ کے بجائے ۱۲۱۲ھ ہے وفات کا۔

ص ۲۹ اصغر علی خاں تخلص اصغر مرحوم شاگرد امیر مینائی مرحوم قبل ۱۹۵۴ء۔

ص ۴۲ پیرزادہ اعظم الدین خاں کے فرزند پیرزادہ معین الدین خاں کے دو فرزند تھے، اشرف الدین خاں، آفتاب الدین خاں۔

ص ۴۵ حکیم وارث علی غالب کے دوست تھے۔

ص ۴۷ حکیم محمد اکمل خاں، چیف انجینئر واپڈا، افتخار الدین خاں کے ددھیالی رشتہ دار۔

ص ۴۹ رحیم یار خاں کے بجائے رحم باز خاں۔

مولوی اکبر علی خاں: ص ۵۱ بقول عرشی صاحب مولوی جعفر علی خاں عرشی صاحب کے چچا تھے۔ ان کے بھائی مختار علی خاں ویٹیرنیری VETERINARY ڈاکٹر تھے، جن کی وفات ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔

مولوی حکیم سید محمد الیاس: ص ۵۲ بتاریخ ۱۱ فروری ۱۹۵۲ء مطابق جمادی الاول ۱۳۷۱ھ کو حکیم محمد الیاس صاحب کا انتقال رات میں تین بجے ہوا، نماز جنازہ صدر اسپتال کے سامنے ۴½ بجے سہ پہر ہوئی اور اذان کے بعد مسجد مولوی غلام جیلانی میں جو قبریں مسجد کے جانب ہیں ان میں متصل [illegible] جنوبی دفن ہوئے۔

ص ۶۱ میاں محمد امیر شاہ کا ایک قلمی دیوان رضا لائبریری رام پور میں [illegible] ہے (اس کا انتخاب [illegible] میں چھپا ہے۔ ادارہ)۔

منشی امیر اللہ تسلیم: ص ۶۶ ایک قلمی دیوان جس میں افسر تخلص تھا [illegible] امیر محمد [illegible] علی شاہ کے لیے لکھا تھا مگر

دینے کی نوبت نہ آئی۔ وہ دیوان محمد اسمٰعیل خاں صبر جوان کے شاگرد تھے، کے پاس رہا۔

حافظ محمد امین قادری نہٹوری: ص ۶۷ شاہ بلاقی عرف شاہ بولن صاحب متوفی ۱۸۰۵ء بالزام غدر سزایاب۔

ص ۷۲ عزیز اللہ خاں رامپوری خلف سید اللہ خاں ملکی برادر عمزاد فائق۔ طالب حسین خاں مرحوم خلف تفضل حسین خاں ہماری چچی کے بھائی تھے۔ گھیر میں رہتے تھے۔ جوان فوت ہوئے۔

مولوی جعفر علی خاں: ص ۸۹ مختار علی خاں کے برادر حقیقی ہیں۔

سید محمد جمال شاہ تخلص مظلوم: ص ۹۱ (صاحبزادے ×) پوتے صاحب زادہ قطب الدین تھے۔

مولوی جمال شاہ خاں صرفی و نحوی: ص ۹۵ وفات ۱۸۹۰ء

حافظ شاہ جمال اللہ: ص ۹۶ بقول سید احمد حسین لکچرار (موضع سدھار متصل تلعدار) سلطان شاہ کا مزار سدھار میں ہے۔

ملا جہانگیر: ص ۹۹ ان کے شاگردوں میں مولانا جلال الدین مولد بجنور، مقیم لاہور تھے جو تقریباً ۱۲۶۶ھ تک زندہ تھے۔ قائم کے شاگرد اردو شاعری میں تھے (بحوالہ تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار ص ۱۵ از مولوی عبدالحلیم نصر اللہ خاں قائم)۔

حکیم حیدر علی خاں حیدر: ص ۱۲۱ ولادت ۱۲۶۰ھ، وفات ۱۳۲۷ھ (بحوالہ دیوان عبدالحق حقی رسفا)

حکیم درویش محمد: ص ۱۲۸ قطعہ تاریخ وفات از ظفر:

چو درویش محمد بُد یکیے — بعلم فلسفی بسیار دانا

فرد تاریخ گفت از روئے افسوس — ز درویشی شدہ منعم بعقبیٰ (۱۲۲۷ھ)

میاں مولوی رشید النبی تخلص فرحت: ص ۱۳۸ ان کا ذکر تذکرہ بہ نام مولوی رشید النبی مجددی صفحہ ۲۳۲ پر ہے۔

ص: ۱۴۰ شاہ عالی گوہر یعنی شاہزادہ عالی گوہر پیشتر۔

ص: ۱۴۱ حافظ محمد امین نہٹوری خلیفہ شاہ بلاقی مراد آبادی کا سنہ وفات ۱۲۰۱ھ نہیں بلکہ ۱۲۰۵ھ ہے۔

حکیم محمد ساجد خاں: ص ۱۴۷ شرح بوستان مکتوبہ ۱۲۴۳ھ میں نے غالباً کتب خانہ قاضی شہر رامپور میں دیکھی تھی۔

مولوی سلام اللہ: ص ۱۵۸ ان کے والد حافظ فخر الدین تھے۔

ص: ۱۶۱ اخوند سید احمد خاں ساکن لال مسجد جدا ہیں جن کے بیٹے مولوی محمد حیات خاں حیات (۱۱۹۹ھ - ۱۲۸۱ھ) تھے۔

مفتی مولوی عبدالقادر خاں تخلص غمگین: ص ۲۲۴ محسن برادس کے پاس ان کے قلمی دیوان کا عکس موجود ہے یہ دیوان ابھی نہیں چھپا ہے اور رامپور میں مولوی منور علی صاحب مرحوم کے خاندان میں موجود ہے۔ مولوی عبدالقادر خاں

کی کتابیں منور علی صاحب کے خاندان میں منتقل ہو گئی تھیں اور ان پران کے خاندان کی کسی لڑکی نے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔

حکیم مولوی حاجی منور علی محدث : ص ۳۷۸ مولوی منور علی صاحب کے نواسے حکیم شکیل احمد جو حکیم اور ڈاکٹر دونوں تھے طبیہ کالج لکھنؤ کے پرنسپل رہے، وہیں انتقال کیا۔

چند مزید اضافے :-

۱۔ **حکیم شفیق الرحمٰن خاں :** ولادت ۱۸۷۸ء وفات ۱۹۲۵ء کلام مطبوعہ نظمیں۔

۲۔ **شیدا علی خاں وکیل :** ماہر شطرنج و گنجفہ وغیرہ مصاحب نواب حامد علی خاں۔ مشہور پتنگ باز وکیل عدالت ہائے رامپور

۳۔ **منشی مظہر علی خاں :** خوش نویس خطِ نسخ مشہور خوش نویس

۴۔ **میاں جی عبداللہ :** سلسلہ یاقوت رقم تھا۔ (عہد محمد شاہی) والد حافظ اسد علی خاں نبیرہ مولوی عبدالقادر خان وزیر بہادر شاہ (مغل بادشاہ)

۵۔ **محمود علی خاں ابن نیاز علی خاں :** مصاحب نواب حامد علی خاں، ماہر شطرنج۔

••

جناب شعائر اللہ خاں
ریسرچ فیلو، خدا بخش لائبریری، پٹنہ

(۲)

اضافہ:

۱- تذکرہ کا تحقیقی سالِ تالیف ۱۶-۱۹۱۵ء ہے جیسا کہ ص ۲۱۵/۴ اور ص ۲۱۹/۱۴-۱۵ کی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وسط ۱۹۲۷ء تک اس میں اضافے ہوتے رہے اور پھر اسے طباعت کے لئے ہمدرد پریس دہلی بھیج دیا گیا اور اس طرح اضافوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اس کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ ص ۲۷۷ پر محمد نبی خاں معجزؔ کے ذکر میں ان کی تاریخ وفات درج نہیں ہے جو کہ ۶/اگست ۱۹۲۷ء کو وفات پا چکے تھے حالانکہ اگست سے پہلے کے تمام مرحومین کی تاریخ تذکرہ میں درج ہے۔

۲- تذکرہ میں فرنگی محل کے مشہور عالم ملّا محمد حسن کا بھی ص ۲۵۱ پر ذکر ہے۔ ملّا حسن کی سال وفات کے سلسلہ میں کچھ مورخین نے لغزش کی ہے۔ احمد علی شوقؔ نے ملّا حسن کا کتبہ دیکھ کر سال وفات ۱۱۹۹ھ تحریر کیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے یہی سنہ قدرت اللہ شوقؔ نے تاریخ جام جہاں نما میں بھی تحریر کیا ہے۔ نیز ملّا حسن کے داماد عبدالاعلیٰ فرنگی محلی نے رسالہ قطبیہ (فارسی، مخطوطہ) میں حسن فاضل محسن بود کے مادہ سے سالِ وفات ۱۱۹۹ھ تحریر کیا ہے۔ ان تمام شہادتوں کی روشنی میں کاملان میں مذکورہ سال وفات مستند قرار پاتا ہے۔ بقیہ تذکروں میں تحریر سال وفات ناقابل اعتبار ہیں۔

تصحیحات:

نمبر صفحہ و سطر	غلط	صحیح
۲۳۵/۱۶	۱۱۵۷ھ	۱۱۶۲ھ
۵۶۲/۱۱	۱۲۸۹ھ	۱۲۸۹ء
۵۶۲/۲۲	۲۵۲/۳	۲۵۲/۵
۵۶۳/۲	ولی اللہ	ولی النبی
۵۶۴/۹	۲۰ جنوری	۲۰ مارچ

نمبر صفحہ و سطر	غلط	صحیح
۶/۵۶۶	سیر حامدی	مسیر حامدی
۶/۵۶۸	والدہ کے برابر	والد کے برابر
۱۴/۵۷۰	تیرہ سو	بارہ سو چھتیس
۱۵/۵۷۰	تسہیل الفرائض	تفہیم الفرائض
۲/۵۷	خاں فرزند	خاں کے فرزند
۱۸/۵۷۱	مفتی محمد سعد اللہ	• ۱۵۱ مفتی محمد سعد اللہ
۲۷/۵۷۱	مولوی سراج الدین	• ۱۵۰/۱۷ مولوی سراج الدین
۱/۵۷۲	۱۲۰۸۷۹ھ	۱۲۰۸-۹ھ
۲۰/۵۷۲	سید دلدار علی صاحب مولانا مرحوم	سید دلدار علی صاحب غفران مآب مولانا مرحوم
۱۲/۵۷۳	۱۷/۲۲۵	۱۷/۲۲۵ وفات ۱۱۶۲ھ
۱۸/۵۷۳	۱۱۲۵۱ھ	۱۲۵۱ھ

• •

مقتدرہ قومی زبان (اسلام آباد) کے کارنامے

○ اشارات تنقید (ڈاکٹر سید عبداللہ) ۱۹۸۶ء، ص ۳۴۰ ○ سرسید اور ان کے رفقا کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ (ڈاکٹر سید عبداللہ) ۱۹۸۶ء، ص ۳۲۲ ○ اردو اسٹیج ڈراما: رادھا کنھیا سے انارکلی تک اردو اسٹیج ڈرامے کی مکمل تاریخ (ڈاکٹر اے بی اشرف) ۱۹۸۶ء، ص ۲۶۰ ○ سطحی کیمیا (ڈاکٹر ایم اے عظیم) ۱۹۸۵ء، ص ۱۱۹ ○ قلب (ڈاکٹر سید اسلم) ۱۹۸۶ء، ص ۷۷۵ ○ نمونۂ منشورات (احسن مارہروی) ۱۹۸۶ء، ص ۶۱۴ ○ قائد اعظم کے شب و روز (خورشید احمد خاں) ۱۹۸۶ء، ص ۱۶۱ ○ لائبریری سائنس اور اصول تحقیق (سید جمیل احمد رضوی) ۱۹۸۷ء، ص ۳۲۹ ○ وفاقی صوبائی عہدوں کے نام ۱۹۸۵ء، ص ۸۴ ○ پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے (پروفیسر ایوب صابر) ۱۹۸۵ء، ص ۲۶۱ ○ اردو رسم الخط (پروفیسر سید محمد سلیم) ۱۹۸۱ء، ص ۱۰۴ ○ اردو املا اور رموز اوقاف: منتخب مقالات (ڈاکٹر گوہر نوشاہی) ۱۹۸۶ء، ص ۳۴۱ ○ املا اور رموز اوقاف کے مسائل: روداد سیمینار (اعجاز راہی) ۱۹۸۵ء، ص ۲۵۳ ○ اردو اور فارسی میں نقل حرفی (فرخندہ لودھی) ۱۹۸۶ء، ص ۸۵، ○ قومی زبان کی ترقی میں صوبوں کا حصہ: روداد سیمینار (اعجاز راہی) ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۴ ○ قومی زبان اخبارات کے آئینے میں (بشیر محمود اختر، خالد الرحمن، سید شفیق الرحمن) ۱۹۸۶ء، ص ۲۲۵

○ The Language Policy of India ---By Mukhtar Zaman 1984. P.250.

○ بھارت میں قومی زبان کا نفاذ: اردو ترجمہ (پروفیسر انور بیگ اعوان) ۱۹۸۵ء، ص ۲۶۵ ○ انگریزی زبان اور ادب کی تدریس میں قومی زبان کا کردار (جیلانی کامران) ۱۹۸۵ء، ص ۲۷۷ ○ قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات: ۱۸۸۲ء کی رپورٹ (ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار) ۱۹۸۵ء، ص ۲۶۴ ○ قومی زبان کے بارے میں اہم دستاویزات: جلد دوم، حصہ اول (ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر نسرین اختر) ۱۹۸۶ء، ص ۲۵۱ ○ بلوچستان میں اردو کی قدیم دفتری دستاویزات (ڈاکٹر انعام الحق کوثر) ۱۹۸۶ء، ص ۳۱۱

○ بلوچستان میں اردو (ڈاکٹر انعام الحق کوثر)' ۱۹۸۶ء' ص ۶۲۵ ○ **کتابیات قانون** (اردو)' عطش درانی)' ۱۹۸۴ء' ص ۴۱۹ ○ **کتابیات اردو مطبوعات ۱۹۸۴ء** (خالد اقبال یاسر)' ۱۹۸۵ء' ص ۱۷۴ ○ **پاکستان کے اردو اخبارات ورسائل**: کتابیات' جلد دوم (ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری)' ۱۹۸۵ء' ص ۲۶۵' ○ **پاکستان کے اردو اخبارات اور رسائل**: کتابیات۔ جلد اوّل (محمود الحسن)' ۱۹۸۵ء' ص ۲۵۷ ○ **کتابیات اردو مطبوعات** (۱۹۸۳ء)' (خالد اقبال یاسر)' ۱۹۸۶ء' ص ۹۰ ○ **کتابیات اردو املا اور دوسرے مسائل** (ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری)' ۱۹۸۶ء' ص ۱۷۲ ○ **دکنی و دکنیات**: وضاحتی کتابیات (ڈاکٹر محمد علی اثر) ۱۹۸۶ء' ص ۲۱۸ ○ **کتابیات تراجم**: جلد اول: علمی کتب (ڈاکٹر مرزا حامد بیگ)' ۱۹۸۶ء' ص ۸۴۳' ۸ ○ **کتابیات تعلیم**: اردو (نسرین زہرا)' ۱۹۸۶ء' ص ۱۵۲ ○ **کتابیات پاکستان کے اردو اخبارات ورسائل ۱۹۴۷ء تک** (ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری)' ۱۹۸۷ء' ص ۲۵۲ ○ **اندلس کا تاریخی جغرافیہ** (محمد عنایت اللہ) ۱۹۸۶ء' ص ۵۱۷ ○ **جغرافیہ خلافت مشرق** (مصنف: جی۔ بی اسٹرینج' ترجمہ: محمد جمیل الرحمٰن: ۱۹۸۶ء' ص ۱۱۰ ○ **تدریس اردو** (ڈاکٹر فرمان فتحپوری) ۱۹۸۶ء' ص ۳۲۹ ○ **اردو میں اصول تحقیق**: انتخاب مقالات: جلد اول (ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش) ۱۹۸۶ء' ص ۴۲۵ ○ **عربی سیکھیے** (عبدالرحمٰن طاہر سورتی) ۱۹۸۶ء' ص ۳۲۰ ○ **اردو زبان میں ترجمے کے مسائل**: روداد سیمینار (اعجاز راہی)' ۱۹۸۶ء' ص ۲۷۷ ○ **روایت اور فن**: ترجمہ (نثار احمد قریشی) ۱۹۸۵ء' ص ۱۸۵ ○ **جامع الامثال**: اردو ضرب الامثال کا ایک جامع معجم (وارث سرہندی) ۱۹۸۶ء' ص ۳۳۲ ○ **خزینۃ الامثال** (شاہ حسین حقیقت)' ۱۹۸۶ء' ص ۲۶۰ ○ **اردو اور پشتو کے مشترک الفاظ** (پروفیسر پریشان خٹک)' ۱۹۸۶ء' ص ۹۵ ○ **کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ**: جلد دوم: تبصرہ (وارث سرہندی)' ۱۹۸۶ء' ص ۵۱۰ ○ **کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ**: جلد اوّل (جابر علی سید) ۱۹۸۴ء' ص ۱۴۳ ○ **کتابیاتِ لغاتِ اردو** (ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری)' ۱۹۸۶ء' ص ۱۸۲ ○ **اسپرانتو — اردو لغت** ([illegible] محمد نارانی)' ۱۹۸۶ء' ص ۷۹۴ ○ **اصطلاحات عدلیہ و مالگذاری** (ایچ۔ ایچ ولسن)' ۱۹۸۵ء' ص ۷۵[illegible] ○ **دفتری ترکیبات' محاورات اور فقرات کی لغت** (مجیب الرحمٰن مفتی)' ۱۹۸۵ء' ص ۲۱۵ ○ **[illegible] اصطلاحات** (ذیلی مجلس اصطلاحات تعلیمات)' ۱۹۸۵ء' ص ۲۵۹ ○ **اصطلاحات بیمہ کاری** (سہیل [illegible])' ۱۹۸۶ء' ص ۵۴ ○ **کشاف اصطلاحات سیاسیات**: حصہ اوّل (محمد صدیق قریشی)' ۱۹۸۵ء' [illegible] ○ **کشاف اصطلاحات**

سیاسیات: حصہ دوم (محمد صدیق قریشی)، ۱۹۸۶ء، ص ۲۶۱ ○ تحقیق اور اصول وضع اصطلاحات پر منتخب مقالات (اعجاز راہی)، ۱۹۸۶ء، ص ۲۸۶ ○ مختصر قانونی اصطلاحات (مولوی فیروزالدین ڈسکوی)، ۱۹۸۵ء، ص ۴۵ ○ کشاف اصطلاحات کتب خانہ (محمود الحسن و زمرد محمود)، ۱۹۸۵ء، ص ۳۴۷ ○ اصطلاحات ریاضی (ذیلی مجلس اصطلاحات ریاضی، کراچی)، ۱۹۸۴ء، ص ۲۲۱ ○ اصطلاحات فنیات (ذیلی مجلس اصطلاحات فنیات)، ۱۹۸۵ء، ص ۲۲۸ ○ سائنسی و تکنیکی اصطلاحات (مجلس اصطلاحات)، ۱۹۸۵ء، ص ۲۲۵ ○ کشاف تنقیدی اصطلاحات (ابوالاعجاز حفیظ صدیقی)، ۱۹۸۵ء، ص ۲۷۷ ○ فن زود نویسی (مرزا محمد ہادی رسوا، ایم۔ایل گوش)، ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۸ ○ اردو ٹائپ کاری: جلد اوّل۔ ثانوی تعلیمی بورڈوں کے نصاب کے مطابق (نور احمد شاد)، ۱۹۸۶ء، ص ۵۵ ○ اردو ٹائپ کاری: جلد دوم۔ ثانوی تعلیمی بورڈوں کے نصاب کے مطابق (نور احمد شاد)، ۱۹۸۶ء، ص ۱۳۷

••

REFERENCES

1. B. N. Pande : Reorientation of study of medieval Indian History. pp. 5-6.
2. Dr. Tara Chand : Hindu Muslim Problems. p. 36.
3. Ibid. p. 37.
4. Ibid. p. 88.
5. Ibid. p. 39.
6. Havell : Aryan rule in India.
7. Ibid.
8. I id.
9. Tara Chand : Influence of Islam on Indian Culture, p. 33.
10. Ibid. p 36.
11. Cunningham : History of the Sikhs pp. 30—31
12. Ibid.
13. Bakhshi Ghulam Mohammad :Seularism : Kashmir's Richest Heritage, the Spirit of India. pp. 469-70.
14. Islam by Mohammad Sarfaraz Husain
15. Mir Khurd, Siyar-ul-Aulia.
16. Ibid.
17. Glimpses of Medieval History : Yousuf Husain.
18. Mi'raj-ul-Ashiqeen.
19. Letter to Malik Khizr, by Sheikh Sharafuddin Yahya Maneri
20. Studies in Medieval Indian History and Culture, by Khaliq Ahmad Nizami.
21. Kalyan B. Advani, (Sahitya Academy)
22. Three Indian Languages, by Dr. K. S. Bedi.
23. Farid-ka-Doha (Hindi), Dihati Pustak Bhandar.
24. Aab-e-Hayat, by Md. Husain Azad.
25. Ram Kumar Verma, Hindi ka Alochanatmak Itihas.
26. Islami Bangla, by Shri Sur Kumar Sen.
27. Muslim Bangla Literature, by Inamul Haq.
28. Refer Sahabuddin in Nazr-e Zakir.
29. Brief History of Bangla Literature; "Nazar-e-Zakir".
30. Muslim Saqafat Hindustan mein, by A. M. Salik.
31. Ghubar-e-Khatir, by Maulana Abul Kalam Azad.
32. Ibid.

—(o)—

through music. He invented two musical instruments : *Saz Khiyal* and *Khat Ras*. He wrote a number of *Zikria* in praise of God which were sung in those days in the *Lalit*, *Bilawal*, *Todi* and *Kalyani ragas*.

An overwhelming number of musical *gharanas* (schools) of repute owe their allegiance to the early saints. These schools might have been fostered by rulers of States. Yet they drew their inspiration from saints, particularly of the Chistiya order, like Tamras Khan's *Gharna* of Delhi, Ustad Faiyaz Khan's *Gharana* of Agra, Huddu Husain Khan's *Gharana* of Gwalior, the Fateh Ali and Ali Bakhsh *Gharana* of Patiala, Alla Diya's *Gharana* in Kolhapur, the Mushtaq Husain and Ishitiyaq Husain *Gharana* of Rampur. In ealier times it was ecstatic and religious devotion to music that institutionalized a particular form of music and rendered it into a school which attracted both Hindu and Muslim disciples.

—(o)—

Hakim Mohammad Ikram Imam Khan, a reputed musician of Oudh, in his book *Ma'din-ul-Musiqee* writes :

> Amir Khusru had such a mastery of Persian music and the *ragas* of Hindi that he was supposed to be a *naik* of that age. In place of the *Pakhawaj* he invented the *Dholak*, and in place of the *Been* he invented *Sitar*. He used to teach music to boys endowed with good voice. *Dhuroo, Rahwa, Matha, Chind, Persand, Dhurpad* were commonly used. He introduced six new modes : *Qaul*, *Qalbana, Naqsh, Gul*, *Tarana* and *Khiyal*.

He was a master in the Persian musical system called *Naqsh*. Persian poetry was sung to twelve tunes. Each had two shades, resulting in twentyfour *ragas*. Each *raga* was to be sung at a particular hour of the twenty-four hours of night and day. It goes to the credit of Amir Khusru that he invented novel *ragas* by combining Persian music with the Indian. Many of these ragas have gone out of use, but still many are a delight to musicians like *Yeman, Zulf, Sarparda* and *Gazgiri*, etc. He also invented many musicial forms like *Sawani, Farodast Pashto, Qawaali* etc.

After the thirteenth century, music was accepted by these saints as a sacred treasure. It was developed by reputed and dedicated musicians.[30]

In this climate it was easy for kings and nobles to patronize music and enrich it with new forms and a new content. The name of Sultan Husain Sharqui, a ruler of Jaunpur, was second only to Amir Khusru's in this field. It became a fashion among the nobility and kings to equip their sons with instruction in music as a necessary part of education.[31] There were Sufis and saints everywhere who were expert in music and worked for its advancement, like Sheikh Malli Khan Gujarati, Sheikh Alauddin and Sheikh Jamal Sahib.[32] Sheikh Nizamuddin Aulia was himself a great critic of music.

Syed Nizamuddin Madhunaik was expert in Arabic, Persian and Sanskrit. He wrote two books on music : *Nad Chandrika* and *Madh naik Singhan* Makhdoom Bahauddin Bunnais was another Sufi who devoted his life to get an access to the Divine

Both the *Chishtiya* and the *Qadria* fraternities sanctioned *Sama'*, musical rhythms, that enhanced the effect of poetry. They enabled the devotee to be plunged in a state of trance called *Haal*. The effectiveness of *Sama'* can be gauged by the fact that many a Sufi embraced death while listening to certain poetic lines which intensely affected their hearts. It is said that Khwaja Bakhtiyar Kaki surrendered his life while hearing the following poetic line :

kushtagAn-e KHanjar-e taslIm rA
har zamAn az GHaib jAn-e dIgarast.

(To those who have been killed by the dagger of submission, there comes new life every moment from the unseen world)

Akhbar-ul-Akhyar, an authoritative work of Sheikh Abdul Haq Mohaddis, shows the keen interest of the saints in Sama' music as a path to the spiritual realms. One of the many incidents that *Akhbar-ul-Akhyar* quotes is that of a young man who was attending an audition at the house of a Sufi, and heard the words :

jAn be-deh, jAn be-deh, jAn be-deh,
fA'ida-e guftan-e bisyAr chIst.

(Surrender life, surrender life, surrender life;
It is of no avail to talk and talk.)

All of a sudden the young man burst out crying "Surrendered, surrendered, surrendered", and his life ended.

Such incidents were not few. Sometimes in order to maintain the emotional pitch, a single poetic verse had to be repeated for hours together.

In the beginning, Persian poetry was resorted to for such gatherings. Persian had been a highly developed language with the treasure of scores of Sufi poets like Attar, Rumi, Jami, Sa'di etc.

Amir Khusru, in his devotion to his preceptor, wrote four volumes of Persian poetry. Each word of his poetry is permeated with divine ecstasy. To match it with appropriate music, he needed to be an expert musician, which he was, being well versed in both Persian and Indian music.

A reference to the Pathan rulers of Bengal like Sultan Nasir Shah (AD 1282-1325) and Sultan Husain Shah, and their religious tolerance, is necessary. They declared Bengali to be the official language of the regime. They got the *Mahabharata* and *Bhagavat Purana* translated into Bengali. This is regarded as the first translation during these early days.[28] The great poet Vidyapati had dedicated his poems to Sultan Nasiruddin. The Sultans were patrons of the Bengali language and tried to enrich it in many ways. According to S. R. Bhattacharya,[22] Shah Husain patronized "Tarja Geet". It is supposed to be the earliest form of the Bengali poetry. (Nazr-e-Zakir)

Upto the fourteenth century, Gujarat Apabhramsha was spoken in Gujarat. Since Gujarat is situated on the western border of India, there was a direct interaction with people of Arabia and Persia. Many Gujarati Saints and Sufis became famous. Among them names of Sheikh Ganjul Ilm (1391), Syed Burhanuddin (1411) and Sheikh Wajihuddin Gujarati are well known. One can see in Gujarati works like *Ramal Chand* and *Kath-Da-Prabandh* the absorption of Persian, Arabic and Turkish words.

Kashmir and Persia had a long history of contacts even before Kashmir's political amalgamation in the Delhi Sultanate. The impact of Persia was direct. The Sufis loved the Kashmiri language and filled it with the romantic Sufi philosophy. Mahmood Ghani, Khwaja Habibullah Nowshaharwi and Nooruddin were the reputed Sufis of their times. In a Kasmiri *Ruba'i* Sheikh Nooruddin says :

> Don't yield before His bows,
> Don't turn your head if you are injured
> by the thrust of His sword.
> Accept willingly all the calamities that He has sent to you,
> Only then would you be honoured in this world and after.

Mahmood Ghani translated many classic Persian works like *Yusuf Zulekha, Laila Majnoon, Sheereen Farhad.* Saifuddin translated *Gulshan-e Raz.*

Music has been another field to which the saints contributed generously. They came to realize that, like poetry, music also elevates emotion to the ecstatic state necessary for union with God.

whether he is *Brahmin* or *Chandal*. Shri Chaitanya initiated the *Krishna Bhakti* movement. The Sufi movement in Bengal flourished through Jalaluddin Tabrezi. Shri Chaitanya had many Muslim followers who were *Vaishnoi* and had abundant poetic work to their credit.[26] The close interaction of Sufism and Chaitanyaism gave rise to Baul songs [27] (AD 1625-1675). They were a creation of Hindu-Muslim unity. This was a movement against all externalism whether of Hindus or of Muslims. It aimed to break all external restraints :

> You wander aimlessly :
> Mandir, Mandir, Masjid, Masjid;
> Oh, my teacher,
> What a headache it is
> The foolish, while weeping, look at me.

Among the Muslim saints whose contribution to the development of modern Bengali is recognized without question is Daulat Kazi. According to Shanti Ranjan Bhattacharya, he was the author who introduced novel-writing in Bengali. His book *Sati Meenavati* had a historic significance. Then there was Ala'ul, creator of a large number of *Vaishanavite* songs. His *Padmavati* is well reputed. Besides, he translated a large number of Persian books into Bengali, like Nizami's *Haft Paikar*, or *Sikandarnama*, etc. His *Vaishnava Padawalis* are very popular in Bengal. Another was Syed Sultan. Besides *Vaishnavite* songs, he has written books on Islamic religion like *Gyan Pradeep*, *Hazrat Mohammad Charit*, and *Nabi Bangash*. In Nabi Bangash he counted all *Brahma, Vishnu, Shiva, Shri Krishna* as *Nabis*, and showed great respect towards them. Mohammad Khan wrote *Maut-ul-Husain* (1645) and Hayat Mahmood wrote *Ambia Bani*. Syed Murtaza was poet of the first rank in Vaishnavite songs. His *Pad Kalpataru* is well known. Sabit Khan wrote *Vidya Sundar*. Ali Raja is known for his books *Gyan Sagar, Saraj Koloop, Dhyan Mala*. He has depicted the love of Radha and Krishna, Ravan and Mandodari, and Yusuf and Zulekha. His conclusion is that one rises from the love for a person to love for the entire creation and the Creator. A volume of Akbar Shah has been discovered. It is in praise of Lord Krishna. Inayatullah translated *Chahar Darwesh*.

In that age, Amir Khusru painted Hindi literature with many hues. In his period principles of literature were not well defined. Poetry was harnessed for religion and politics. It was not an ordinary thing to create a literature for popular recreation.[25]

From the thirteenth century onward, not only Khusru but a large number of Sufi saints contributed to the development of Hindi language.

Mulla Dawood (AD 1295) produced *Prem Katha Chandayan*. Qutban in 1501 produced *Mirgavati*. Malik Manjhan brought out *Madhu Malti* in 1 45. Malik Mohammad Jaisi wrote *Padmavati*. Sheikh Rahim was known for his *Prem Ras*. Many other works of Noor Mohammad, Qasim Shah, Usman and Jan are also noteworthy. A new climate developed wherein devotional songs were sung. *Nirgun Bhakti* and *Sagun Bhakti* dominated the religious thinking of the day. Thus Hindi got a start and it flourished at the hands of these Sufis and saints.

Urdu has never been a court lanauage. It was regarded as a language of the *bazar* and the *lashkar*. Urdu and Hindi both developed out of the interaction between the indigenous tongues and Persian, Turkish and Arabic words.

In the Deccan, Khwaja Gesu Daraz' *Mi'raj-ul-Ashiqeen* (AD 1422) is supposed to be the first work of Urdu. It is a philosophic treatise. Mi'raj-ul-Ashiqeen has a surprisingly smooth flow and it determined the future development of Urdu and Hindi both in the South and in the North.

Besides Khwaja Gesu Daraz, a very prominent writer of this common language was Shah Miranji (1496). He wrote both poetry and prose. Wajhi's *Sab Ras* is well known. Shah Burhanuddin Janam and Shah Aminul A'la were others who developed this language in the South.

Growing out of the *Magadhi Apabhramsha*, modern Bengali assumed the status of a standard language in the fourteenth century. During this period the entire cuuntry was waking to new religious heights. The keynote of this movement was the apprehension of the unity of God and the belief that He can be achieved through intense love. God views everyone equally,

I am not a Hindu, nor a Muslim,
I am not a mulla nor a kazi.
My heart does not fear death,
Nor does it long for paradise.
Oh God, give me Your vision,
Everything else is false.

Hindi and Urdu, both the languages, developed out of *Khari Boli*. Amir Khusru[24] (AD 1255-1325), a disciple of Nizamuddin Aulia, is regarded as the first poet of *Khari Boli*. Prior to him whatever works survive they are in *Arsha Apabhramsha Prakrit* or *Saurseni Apabhramsha*.

In *Khari Boli*, it is said, Amir Khusru has written one lakh stanzas consisting of *pahelis* (ridddes), *do sukhna*, *kah-mukarnis*, *savnias*, etc. They were so simple and flawless that they soon entered the everyday language of the people. Hindi and Urdu developed in the direction that he indicated. He had an intense feeling of love for everything that was Indian. His *Hindiwi* is very congenial to Indian life. People still sit together in the village meeting place and test each other's wit through Khusru's riddles. His songs on the rainy season are still sung by young girls while swinging in the rainy season. His *dholak* songs are still heard on festive occasions like marriages.

Amir Khusru was deeply devoted to Nizamuddin Aulia, who was his spiritual master. When he passed away, Khusru is reported to have recited the verse :

gori sowEy sEj par mukh par dArE kEs
Chal khusru ghar ApnE sAnjh hui chau dEs

(The beloved lies on the coach
with her black tresses scattered over face.

Oh, Khusru, return to your home,
Night has fallen over the whole country.)

It is said that Khusru combined in his personality the variegated colours of Indian culture. He was poet, mystic, artist, humorist, musician, soldier, historian naturalist, linguist and above all a humanist.

The water runs below, the blossoms above,
and lovely forests stand on the sides :

The fragrance of Tamachi saturates the air;
With the blowing of the north breeze,
the Kinjhir becomes a cradle.

Many other saints translated Persian and other classical stories into Sindhi. *Hatim Tayee, Laila Majnu.* and *Gul-i Bakauli* have added to its literary stock.

Sheikh Fariduddin Shakarganj, popularly known as Baba Farid, is regarded as the first poet of Punjabi language. There were other Sufi poets before him– Masood Sa'd Salman was one of them. His name has been mentioned by Amir Khusru, and others as the first poet of Punjab. But his *Divan* is not available today. Other names were of Khatib Ali[22] (AD 1093-1148) and Abdul Rahman (AD 1018). But with Baba Farid a new star shown on the horizon of Punjab. He granted an independent status to Punjabi by his *dohas*. These *dohas* are highly revered and are preserved in *Granth Saheb*. They portray ecstatic love for God. He implores people not to be contented with outer appearances but to see within : [23]

If anybody hits you, do not repay him back in the same coin,
Since you are to go to Heaven, better touch his feet (Doha 7).
Oh, Farida, why do you wander in the thick of the jungle ?
You are searching for Him outside yourself,
While He is hidden within you. (Doha 18).
How is it possible to sow *kikar*
but start expecting a crop of *kishmish* ?
Weave wool but aspire for silken cloth ? (Doha 23).

There is a long array of poets who have greatly contributed to building up Punjabi language like Syed Shah Waris (AD 1375-1395), Qutban AD 15 3), Sultan Baba (AD 1631-1691), Ali Hyder AD 1690-1785), Bull ey Shah (AD 1680-1752), Shah Sharif (AD 1724), and many others.

All these saints were highly catholic in their attitude. They had intense yearnings for God. In the words of Sultan Baba :

The universality of love of that age is well expressed in the inscription Abul Fazal inscribed in a temple in Kashmir. It runs thus :

> O God, in every temple I see people that seek Thee,
> And in every language I hear spoken people praise Thee.
> Polytheism and Islam flee after Thee.
> Each religion says, Thou art one without equal . . .
>
> He who from insincere motive destroys this temple,
> should first destroy his own place of worship.[17]

Thus we find that on both the intellectual and the emotional levels, the saints' outlook extended like an ocean.

One of the distinguishing characteristics of the saints was that they were not passive seekers of truth. They actively sought to purge the community of all evils out of the fathomless love that surged in their hearts. Renunciation of the world has never been an ideal of these saints. They remained in touch with life, kindled in it a new zest and contributed to the socio-cultural and moral development of the community.

It is true that quite a number of them renounced the world and annihilated their selves (*Fana fi-Allah*). "Sheikh Sharafuddin Yahya Maneri kept standing in the jungle for years. Sheikh Ahmed Khattu fasted for forty days continuously, each fast broken by one date. Sheikh Mohammad Ghous Gwaliori spent twelve years in meditation on the mountains of Chinar." But renunciation was not the general tendency of these saints.

Sheikh Nizamuddin Aulia explains it thus :

> Renunciation does not imply giving up garments or food. Renunciation requires both. One should take food and wear a dress. However, it is but essential that one should spend whatever one earns. One should not keep his heart in worldly things) and should remain detached throughout.

Hazrat Khwaja Gesu Daraz in the Deccan insisted upon his disciples that they remain in service : "If noble souls gave up their missions, undesirable people would slip in, to the grief of common people. The greatest worship is to do justice with everyone and never be tempted by wealth."[18]

No wonder, King Zain-ul-Abedin was the chief mourner at Nund Rishi's funeral. During his lifetime, he founded an order of Rishis which exercised tremendous influence on Hindus too. The last of the great Hindu mystic poets, Parmanand, who died towards the end of the last century, contributed a great deal towards uplifting people morally and spiritually.

This rich tradition in history and literature has had its impact on the life of the people of Kashmir. The family of a Hindu emissary who was deputed to negotiate with Ranjit Singh to rescue the people of Kashmir from the tyranny of Pathan rule, was given protection by a Muslim shawl-merchant who preferred death to the betrayal of trust. The holy cave of Amarnath, which was declared "lost" during Pathan rule, was rediscovered by one *Malik* of a village in the vicinity of Pahalgam. To this day, the Muslim *Malik* family receives a share from the offerings made by the thousands of Hindus who visit the holy cave annually. The shrine of *Shah-e-Hamadan* and the temple of Mahakali exist together at Khanqah Mohalla in Srinagar city. The shrine of *Makhdom Saheb* and the temple of goddess *Sharika* at *Hari Parbat* are also similarly situated. Be it *Id* or *Shivaratri*, the participation is not only of one or the ot er community but of the people of Kashmir as a whole. One may even say that the spectacle is unique to Kashmir.[13]

Faith in the unity of God was not to them an intellectual proposition alone. It was infused with universal love. Love alone could lead to the realisation of oneness.[14] Nizamuddin Aulia is quoted as saying :

"The main purpose and objective of man's creation is the love of the Supreme Being."[15]

Along with the love of God goes the love for His entire creation. Nizamuddin Aulia explained it thus :

"Oh Muslim ! I swear by God that He holds dear those who love Him for the sake of human beings, and also those who love human beings for the sake of God."[16]

Their love had no boundaries. It was limitless. It took every one under its magnificent umbrella.

The universality of love of that age is well expressed in the inscription Abul Fazal inscribed in a temple in Kashmir. It runs thus :

O God, in every temple I see people that seek Thee,
And in every language I hear spoken people praise Thee.
Polytheism and Islam flee after Thee.
Each religion says, Thou art one without equal . . .

He who from insincere motive destroys this temple,
should first destroy his own place of worship.[17]

Thus we find that on both the intellectual and the emotional levels, the saints' outlook extended like an ocean.

One of the distinguishing characteristics of the saints was that they were not passive seekers of truth. They actively sought to purge the community of all evils out of the fathomless love that surged in their hearts. Renunciation of the world has never been an ideal of these saints. They remained in touch with life, kindled in it a new zest and contributed to the socio-cultural and moral development of the community.

It is true that quite a number of them renounced the world and annihilated their selves (*Fana fi-Allah*). "Sheikh Sharafuddin Yahya Maneri kept standing in the jungle for years. Sheikh Ahmed Khattu fasted for forty days continuously, each fast broken by one date. Sheikh Mohammad Ghous Gwaliori spent twelve years in meditation on the mountains of Chinar." But renunciation was not the general tendency of these saints.

Sheikh Nizamuddin Aulia explains it thus :

Renunciation does not imply giving up garments or food. Renunciation requires both. One should take food and wear a dress. However, it is but essential that one should spend whatever one earns. One should not keep his heart in worldly things) and should remain detached throughout.

Hazrat Khwaja Gesu Daraz in the Deccan insisted upon his disciples that they remain in service : "If noble souls gave up their missions, undesirable people would slip in, to the grief of common people. The greatest worship is to do justice with everyone and never be tempted by wealth."[18]

No wonder, King Zain-ul-Abedin was the chief mourner at Nund Rishi's funeral. During his lifetime, he founded an order of Rishis which exercised tremendous influence on Hindus too. The last of the great Hindu mystic poets, Parmanand, who died towards the end of the last century, contributed a great deal towards uplifting people morally and spiritually.

This rich tradition in history and literature has had its impact on the life of the people of Kashmir. The family of a Hindu emissary who was deputed to negotiate with Ranjit Singh to rescue the people of Kashmir from the tyranny of Pathan rule, was given protection by a Muslim shawl-merchant who preferred death to the betrayal of trust. The holy cave of Amarnath, which was declared "lost" during Pathan rule, was rediscovered by one *Malik* of a village in the vicinity of Pahalgam. To this day, the Muslim *Malik* family receives a share from the offerings made by the thousands of Hindus who visit the holy cave annually. The shrine of *Shah-e-Hamadan* and the temple of Mahakali exist together at Khanqah Mohalla in Srinagar city. The shrine of *Makhdom Saheb* and the temple of goddess *Sharika* at *Hari Parbat* are also similarly situated. Be it *Id* or *Shivaratri*, the participation is not only of one or the ot er community but of the people of Kashmir as a whole. One may even say that the spectacle is unique to Kashmir.[13]

Faith in the unity of God was not to them an intellectual proposition alone. It was infused with universal love. Love alone could lead to the realisation of oneness.[14] Nizamuddin Aulia is quoted as saying :

"The main purpose and objective of man's creation is the love of the Supreme Being."[15]

Along with the love of God goes the love for His entire creation. Nizamuddin Aulia explained it thus :

"Oh Muslim ! I swear by God that He holds dear those who love Him for the sake of human beings, and also those who love human beings for the sake of God."[16]

Their love had no boundaries. It was limitless. It took every one under its magnificent umbrella.

of truth and peace in the language of the people. Her poetry, known as *Yakyas*, is committed to memory by thousands regardless of their religious faith. Her verses are quoted even in daily conversation, and their wide use has given a healthy direction to individual and community ideals.

In one of her sayings, she exhorted people not to differentiate between a Muslim and Hindu. "They are not different", she said, "Know thyself, if thou art sane", she advised. In a verse, she castigated the fanatical followers of so-called "religion" and said:

> O Mind, hast thou become intoxicated at another's expense?
> Why hast thou mistaken truth for untruth?
> The little understanding hath made thee
> attached to others' religion,
> Subdued to coming and going, to birth and death!

Lal Ded criticized the cold and meaningless way in which religious rituals were performed. She said that God did not want meditations and austerities. The abode of bliss could be reached only through love.

Nund Rishi, born in 1377 AD, was a pious man. His fame as a saint and the glory of his spiritual attainments travelled far and wide, attracting to him a great number of followers. His verses have become stamped in people's memory. He preached against the snares of false preachers:

> I saw a priest blowing out fire (and)
> Beating a drum to others,
> The priests have nice big turbans on their heads,
> They walk about daintily dressed,
> Dressed in priestly robes they indulge in mutton,
> They run away with cooking posts under their arms.

The Rishi exhorted his followers to perform good actions. He wanted people to lead disciplined lives in which they cared about others. In one of his sayings, he asks:

> Thou hast eaten six platefuls, one like another,
> If thou art a priest, then who are robbers?

material prosperity of the people that one cannot fail to admire him...Zainul-ul-Abedin was deservedly surnamed *'Bud Shah'* or great king. Inspite of six centuries having rolled by since he lived, his name is still remembered with genuine reverence and gratitude. Take the name of *Bud Shah* before a Kashmiri and at once he will, with a happy countenance, rhyme wi.h *'Padshah'* "

During the reign of Sikandar Zain-ul-Abedin's father, the Hindus suffered enormously through the persecution of his minister Siya Butt, a new convert ro the Muslim faith. It is said that the Hindus fled away and only eleven families remained in Kashmir. With Zain-ul-Abedin's ascending the throne, confidence returned to them. He sent messengers to them inviting them to return to their homeland. They responded with pleasure. He gave the pride of place in his court to Shri Butt, a great physician, and Jonaraj, a great historian who updated the chronology *Raja-tarangini*. Himself a scholar of Persian and Sanskrit, he encouraged the translation of a major portion of the Upanishads from Sanskrit into Persian. The *Katha-Sarit-Sagar* was also translated into Persian during his reign. A general toleration of all faiths was proclaimed and practised. The king built temples and penalized the killing of cows and himself abstained from meat-eating during the holy festivals of the Hindus. The *Rajatarangini* gives a detailed account of how the king took part in the annual *Nag-yatra* festival when he would don the robes of a Hindu mendicant and performs the journey in the company of other pilgrims

Two other names that come easily to the lips of a Kashmiri are of Lalleshwari, more popularly known by the homely name of Lal Ded (Mother Lal), and Sheikh Nur-ud-Din, better known as *Nund-Rishi*. They are believed to have been contemporaries. Both of them as mystics saints and poets, continue to have an equal claim on the affection of both Hindus and Muslims. In fact, both communities hold forth divergent views as to which community they originally belonged.

Lalleshwari was a follower of Shaivism. Born towards the middle of the fourteenth century AD, she preached the message

Islam entered Kashmir in the fourteenth century A.D. The people welcomed its exponent, the great Shah Hamadan, with open arms, and the synthesis of Hindu and Islamic religious thought found its greatest exponents in Lalleshwari and Sheikh Nurud-Din, who continue to be held in great esteem by both Hindus and Muslims. Kashmir has witnessed dark periods of religious persecution, but the people, true to their tradition, have lived like brothers, giving solace and shelter to their brothers in distress.

Two names that come very easily to an average Kashmiri's lips are Lalitaditya (724-760 AD and Zain-ul-Abedin (1422-1474 AD . Lalitaditya ushered in an era of national glory, prosperity and peace. He was tolerant towards all schools of religious thought. Buddhism and Hinduism, the two prominent creeds of the time, received patronage at his hands—a Hindu ruler, who constructed temples for the Buddha as well as for Shiva, Vishnu and other gods. The king offered liberal patronage to men of letters. Learning flourished, and Kashmir became the "cynosure of foreign scholars, and many cultural missions set out from the country." His faults, as recorded by Kalhana, notwithstanding, he was above religious bigotry. His commander-in-chief was a Buddhist and so were many of his high officials. To talented men of all nationalities he showed great respect and regard. He brought from Kanauj the two famous poets Bhavabhuti and Vakpatiraja and installed them in his capital in Kashmir. Zain-ul-Abedin, popularly known as Bud Shah (the great king), was not a conqueror but remains a beacon light for the people of Kashmir for their cherished principles of tolerance and fraternal living. "Possessed of a broad and tolerant outlook", says Pandit Anand Koul, "and dominated with a desire to benefit mankind, he ruled with such equity and justice and did so much to improve the

Marco Polo. Ibn Batuta and Abdur Razzak noticed a large number of Muslim settlers along the Western coast with their mosques and flourishing centres of trade. Each settlement of the Muslims in the Eastern and Western coasts grew into a centre of religious propaganda It is really surprising that within the course of a few centuries, before the advent of the Turks, large areas in the Eastern and Western regions turned into centres of Islamic civilisation and culture without the least resistance from the Sons of the Soil. The rise of the Bahmani Kingdom in the South offers a glaring instance of the impact of Islam in South Indian politics and culture. This impact is much more glaring when we take into account the rise of Bijapur and Golkonda as two other great Muslim kingdoms in the later days.

Northern India came into direct contact with Islam from the time of Muhammad bin Ghori. From the thirteenth century onwards Hindu imperialism based on loose confederation of autonomous principalities gradually gave way to Turkish suzerainty and paramountcy. Hinduism came face to face with a dynamic religion which threw a challenge to the philosophic basis of Hinduism, attacked its social structure and denied its pantheistic doctrines.

Speaking of the moral effect of Muslim conquest, Cunningham writes :

"The influence of a new people who equalled or surpassed Kshatriyas in valour, who despised the sanctity of Brahmins, and who authoritatively proclaimed the unity of God and His abhorrence of images, began gradually to operate on the minds of the multitudes of India . . . New superstition emulated old credulity. *Pirs* and *Shahids*, saints and martyrs, equalled Krishna and Bhairav in the number of their miracles, and the Muhammadans almost forgot the unity of God in the multitude of intercessors whose aid they implored".[11]

In the words of Cunningham again :

"The first result of the conflict (between Hinduism and Islam) was the institution, about the end of the fourteenth century, of a comprehensive sect by Ramananda of Banaras. He seized upon the idea of man's equality before God, and admitted all classes of people as his disciples".[12]

in India cannot be explained away by external factors alone. It became possible owing to the political disintegration and moral degeneration of India since the death of Harsha. Havell has emphatically observed that it was not the philosophy of Islam but the democratic nature of the Islamic society that attracted the attention of the Indian people [8].

The Arabs were the first among the Muslims to come to India, and they had settled down firmly in South India by the end of the tenth century. Henceforth Muslim influence began to grow rapidly. They were heartily welcomed as traders and were allowed by the local princes of Malabar to acquire lands and to practise their religion freely. Islam is essentially a missionary religion and the Arabs experienced no difficulty in preaching their gospel and winning converts from the local people. They created a great stir among the Hindu populace as much by their peculiar beliefs and worship as by the zeal with which they professed and advocated them [9]

Islam found a congenial atmosphere in South India. Religious conflicts had been going on in South India as Neo-Hinduism had been struggling with Buddhism and Jainism for ascendancy. The religious atmosphere bewildered the common people; and it was at such a juncture that Islam appeared on the scene with a simple formula of faith, well-defined dogmas and rites. The result was a large number of voluntary conversions of unsophisticated people to Islam followed by the conversion of the last of the Cheraman Perumal Kings of Malabar to the new religion in the first quarter of the ninth century. According to some, it was with a view to propitiating the Arab traders so that they might enrich the Kingdom of Malabar by their prosperous trade and commerce that the Perumal King embraced Islam. Whatever might have been the motive of the Malabar King it cannot be gainsaid that the Muslims came to acquire great influence and importance in Malabar region under the patronage of the local princes. The number of Muslim settlers in the dominion of the Zamorin of Calicut continued to increase by leaps and bounds, and in his eagerness to train his men as expert mariners and sailors, the Zamorin "gave orders that in every family of fishermen in his dominion one or more of the male members should be brought up as Muhammadans' .[10]

sacrifices the Musalmans have made for the evolution of a common culture in India. Take the question of language which is of fundamental importance, the chief medium of expression of the intellect and of the spirit. Arabic is the sacred language of Islam it was also the mother tongue of those early invaders who came to Sind. It is not now the language of any group of Muslalmans in India although it is studied by the learned for obvious reasons. Turkish was the spoken language of the Muslim conquerors from Central Asia; Persian was the language of the court from the beginning of Muslim rule till its final overthow. Neither of these languages is today spoken by the Indian Muslims, nor has the conqueror imposed them on the conquered.

On the contrary, the Muslims adopted the Indian languages and enriched them with words drawn from their languages. The Muslims of Punjab speak Punjabi, of Bengal Bengali, of Gujarat Gujarati; in other words, they speak the dialect of the region where they reside, and there is no difference between them and the Hindus in their forms of speech. There remains one language regarding which much controversy rages today, namely, Urdu. Now Urdu is not a Muslim language, it is not spoken in any of countries where Islam is or has been the religion of the majority of the people, the homelands of the conquerors of India. Urdu belongs to Aryan branch of languages, its basic structure grammer and the greater part of its vocabulary are Indian. In fact the origin of Urdu is the dialect which is spoken round about Delhi and which is known to linguists by the name of *Khari Boli*. It became the spoken dialect of the Musalmans also when they settled in and about Delhi. The spoken dialect evolved into a literary language and both Hindus and Musalmans have made it as such throughout the centuries. In fact it may be truthfully said that, before the use of English among the Indian educated classes, Urdu occupied the position of the *lingua indica* of India.

According to Havell, a great admirer of Hinduism, Islam influenced the Hindu social life in two ways. There was a rise of rigidities in the Hindu society. Islam also gave the depressed and downtrodden masses the prospect of improving their social status and economic lot. Havell says that the Muslim success

dependence and subordination of woman and the use of the veil were common to Hindus and Muslims[5].

It is true that the religious fasts and festivals of the two communities were different but the manner of observing them was more or less similar. *Muharram* celebrations were assimilated to *Dasehra*, *Shab Barat* to *Shivaratri*, *Ramzan* and *Id* to *Navartara* etc. Besides there were many fairs and festive occasions which were common; and even so far as the peculiar communal festivals were concerned, the Hindus and the Muslims participated in both, e.g. *Holi* and *Muharram*.

The Muslims adopted many Hindu funeral ceremonies, for example, the *Tija*, the *Daswan* etc. Then ceremonies concerning pregnancy and childbirth like the seventh month, sixth day of child birth, the shaving of the child's head (*Mundan=Aqiqa*), licking of *Khir*, boring of ears, birthday anniversary etc., were common to both. Even such purely Hindu practices as the immolation of the widow on the death of her husband and *Jauhar* were occasionally resorted to by the Muslims. Ibn Batuta relates the story of the defeat of Ainul Mulk by Muhammad Bin Tughlaq and tells how his wife plunged into death after her husband Again the *Zafar Namah* describes the *Jauhar* committed by wife of Kamaluddin, governor of Bhatnair, when he proceeded to fight against Timur. Amir Khusru's admiration is evident from his famous lines :

chUn Zan-e hindi kasE dar Ashiqi dIwAna nEst

soKHtan bar sham'-e shauhar kAr-e parwAna nEst;

Dress is the most outstanding expression of the inner character of a society—of its grades and classes, of its psychological values, tabus and reticences. From this point of view it is important to notice how Muslims in India largely discarded the garments worn in Arabia, Iran and Central Asia and mainly adopted Indian costumes and clothes. The use of Arab *amAma*, *jubba*, *ridah*, *tahmad* and *tasma* and of Central Asian *kulAh*, *nima*, *moza* etc., disappeared, giving place to Hindu *pagri* and *chira*, *kurta* and *angarkha*, *patka* and *dopatta* *pajAma* and *Juta*[7].

If we turn from such externals to the cultural aspects of life, we find the same kind of fusion there. Let us consider the

Mughals, Turks and Afghans and whose descendant continued to exercise authority and dominion for five hundred years and more, have similarly disappeared almost completely. The Muslim conquerors have not maintained their racial identity or clan organization and have merged themselves into the general mass of the Indian people. Tribes, clans and families whose names make such a noise in the annals of the of Muslim rule are today barely known and are all but forgotten. The process of assimilation has been continuous throughout the centuries. Conversion, marriage and settlement in India without any desire to return to or have relation with the peoples of the homelands have removed their differences and brought about racial homogenity.

Socially the Musalmans of India developed an organization similar to that of the Hindus. Muslim societies in India, unlike Muslim societies in other countries, became divided into castes comparable with the Hindu caste system. Sayyids correspond with Brahmins, Mughal and Pathans with Kshatriyas, Shaikhs with Vaisyas, and the group of artisans craftsmen and labourers with Shudras. The distinctions between the four divisions were based not merely on economic and vocational considerations, but also on heredity, which was recognized throughout the middle ages as a factor of supreme importance among both the Musalmans and Hindus.

In every social system woman holds a characteristic position. Arab and Turkish societies differ considerably from Hindu society in this matter. Yet in India the Muslims followed not the customs of Arabia and Turkistan but those of India. In toilet, dress ornaments, ways of social intercourse, daily routine of life, they adopted Indian ways and manners. The Muslim marriage ceremonies were adopted from Hinduism *Nisbat, Haldi, Mehndi, Tel, Mandwa, Barat, Jalwa, Kangan*, etc. were Muslim adaptations of Hindu ceremonies. The only difference that remained was that in the Hindu marriage bride and bridegroom went round the fire to the chanting of Vedic *Mantras* while in the Muslim marriage they were joined together in bonds of matrimony by the *Qazi* who read appropriate verses from the Quran. Early marriage of girls, prohibition of widow marriage,

The Quran teaches tolerance. "Let there be no compulsion in religion" is its eternal commandment. And beautifully has the reason for this commandment been given: "But if my Lord had pleased verily all who are in the world would have believed together, wilt thou then compel men to become believers?"

The Bible teaches tolerance and forgiveness in these noble words: "Whoever smite thee on thy right cheek turn to him the other also." The commandment in the Quran "Recompense evil with that which is better" is almost a paraphrase of the Christian commandment. The same idea is expressed with greater fullness of imagery in the following words of the Quran: "And a paradise, vast as the heavens and the earth, was prepared for those who mastered their anger and forgave others".

The Bhagwad Gita says: "However men approach Me, even so do I welcome them, for the path men take from everyside is Mine, O Partha." And again, "O Son of Kunti, even the devotees of other deities who worship full of faith, they also worship Me, though not according to the established custom."

In Akbar's time a unity was reached in the national consciousness which extended from the cottage to the throne. Akbar's efforts to give it the form of a new religion were bound to fail because religions could not be created through politics; and, also because a movement whose essence consisted in transcending all religious formalism could not be imprisoned in new bonds though cast in gold and set with diamonds. But, after this, politics could not be an obstacle in its path; and we find that throughout the Mughal period, though thwarted for a while to some extent, the movement continued to widen and deepen in its course.

It will be conceded by everybody that, so far as race is concerned, the Muslims of India, with the exception perhaps of a very microscopic minority, are wholly indistinguishable from the Hindus. There is scarcely any trace of the old Arabs, Turks and Persians left. It is impossible in the population of Sind to distinguish the vestiges of the Arab soldiers who invaded it under Muhammad Bin Qasim or of the Arab families which ruled over the valley for hundreds of years. The central Asian clans which entered India in the wake of the Ghaznavides Ghoris,

although the Musalmans have to ask them to appoint their *qazis* and governors.

Inspite of the existence of two religions, there were not any deep cultural differences between them. They took pleasure in the study of each other's religion, philosophy and science. Their arts were common. They had no prejudices in regard to participation in the fairs and festivals of each other. They spoke the same language, wore similar clothes, furnished their houses in the same style, had similar outlook upon the life of this world, if not also the next. Their industry and commerce, urban and rural occupations. were parts of one economic system.

While in the middle ages, under Muslim rule, Hindu and Muslim reformers had led movements of religious and moral purification concerned with both communities, the reformers of the 19th century were exclusive; for example, compare Kabir, Nanak, Chaitanya, Dadu, Tukaram, Basveshwar, Pran Nath and others with Sir Saiyed and Swami Dayanand. The medieval religious leaders cared essentially for the substance and reality of religion and deprecated emphasis upon external acts, doctrines and dogmas; on the other hand the modern reformers have been concerned chiefly with the philosophy and tenets of religion rather than its inner emotional and spiritual content.

No account of cultural synthesis is complete without a discussion of religion. Of the Muslims' attitude towards religion other than their own, a great deal of misunderstanding prevails on account of the false propaganda spread by their enemies, especially European writers belonging to Church; and the result has been that the non-Muslim world has almost come to believe that Islam has been a religion of violence, of force, of uncompromising rigidity and bigotry. But the facts are, however, quite contrary to the popular belief. Long before Europe had learnt to enquire about religion under scientific and detached spirit, many Muslim learned men had compiled books on comparative religion in which they displayed an amazingly true and rationalistic attitude of mind. Among them was the most eminent scholar, Abu Raihan al-Beruni.

The underlying forces for this strong social synthesis were the great precepts of religion that acted as powerful brakes.

social and cultural synthesis, political integration and a secular outlook. Destiny had ordained the Mughals to play this unifying role, and inspite of disruption which followed at the end of Aurangzeb's rule, the convulsion of policies could not overwhelm the synthesis of social life, and Hindu-Muslim relations continued the same upto 1857.

The Universal surge of loyalty and devotion towards Bahadurshah, the symbol of political revolution conclusively showed, for the first time in history, that India had become politically self-conscious and that the foundations of Indian nationalism had been truly and deeply laid. [2]

Throughout the medieval ages the Muslims took enormous pains to acquaint themselves with the religious literature of the Hindus. They translated books of important texts into Persian, —the Vedas, the Upanishads, the Mahabharata, the Ramayana, the Dharma Shastra, the Purana, the Yoga Vashistha, the Yoga Shastra and the Vedanta Shastra. [3]

Among the later writers may be mentioned the name of Mirza Mazhar Jan Janan (1699-1781 AD). Mazhar said about the Hindu worship of idols :

In idol worship the process is similar to the *Dhikr*, contemplative ritual, which is prescribed by the Muslim Sufis. [4]

Mahmood Shabistri (AD 1317), the well-known writer of Gulshan-e-Raz, writing on the theme of the idol worsbip, explains the difference and similarity between it and Islam :

"The idol is the expression of love and unity in this world, and to wear the sacred thread is to take the resolve of service. As both faith and unfaith are founded in existence, unity of God is the essence of idol worship. As things are the expression of existence, one out of them must at least be the idol. If the Muslim knew what the idol is then he would understand that religion consists in idolatry and if the idol worshipper understood the idol, he would not go astray in his faith". [5]

Sir W. W. Hunter in his book, The Indian Musalmans quoted *Fatwa* of the Qazi of Jaunpore in which he declares that Muslims should regard regions under the Maratha rule as *Dar ul-Islam*, on the ground that the Rulers permit the Muhammadans to say their Friday and Id Festival prayers and maintain the laws of Islam

Late Dr. Shafa'at Ahmed Khan, a well-known scholar of modern Indian history, rightly said that, "for the scientific student of history India is a fallow field beneath which lay burried a civilization and a culture which were to become objectives alike of admiration and respect. Indian historian must consequently, reach forth across the gulf of ages, and base his work on the severe frame work of abstract truth."[1]

History demands a clear vision of the world in which we live. History is capable of changing our vision of the contemporary world. History requires imagination, yet it is not a mere romance. History demands philosophical background, yet it cannot be achieved by philosophic speculation. History rests on the belief that we are the products of our past and that it is desirable and necessary that we should know how we have come to be, what we are. But we have to acknowledge the fact that each generation creates its own past. Under the stress of nationalism and national aspirations of India the past is being re-examined and re-interpreted in accordance with new interests.

When the followers of Islam came to India they must have seen that the entire country lived upto high tenets in regard to religious tolerance, perhaps the highest for the age in which they were given. They must have wondered all the more that the people, who were so tolerant to outsiders and so free from all racial and political bias, were the most conservative in the world and rigidly exclusive in their social habits and customs. The mosaic of their caste system with its political replica of independent and conflicting units had to be built up anew into harmonious structure. The people had to be welded into common brotherhood and corresponding political unity had to be evolved to serve their common needs and save them from unending conflicts. The need of the hour was religious tolerance,

The Legacy of Islam:
A Panorama of Composite Culture

29. Ibid., p. XXXV.
30 Vide Aziz Ahmad : Islamic modernism in India and Pakistan pp 52-60.
31. Chiragh Ali : op., cit., p. 11.
32. Ibid., pp. 10-11.
33. Ibid., pp XXXVI.
34 S. Khuda Bakhsh : Islamic Civilization, Vol. II, p. 75.
35. S. Khuda Bakhsh : Essays : Indian and Islamic, p. 220.
36. Ibid., p. 284.
37. S. Khuda Bakhsh : Islamic Civilization, Vol. II, p. 105.
38. Ibid., p. 99.
39. Vide Lanka Sunderam : A Secular State for India, p. 47.
40. Husain B. Tyabji : Badruddin Tyabji, p. 78.
41. Vide Halide Edib : Inside India, p. 92.
42. Vide Aziz Ahmad : Op., cit., p. 112.
43. Vide Ram Gopal : Indian Muslims, pp. 115-116.

— :o:—

REFERENCES :

1. Wood Papers : Wood to Elgin, March 3, 1862.
2. Hamilton to Curzon, 26 March 1888.
3. Cross to Dufferin, 15 January 1887.
4. Tabqat-i-Akbari, Vol. I, p. 82.
5. Tarikh-i-Firoz Shahi. p. 7-8.
6. Ibid., p. 296.
7. Medieval India, Quarterly, Op., cit., p. 5.
8. History of Aurangzeb, by Jadunath Sarkar, Vol. III, p. 319-20
9. This farman was brought to the light by S. M. Jaffar, Esqr., Director of Archives, Pakistan, to Shri Gyan Chandra.
10. High Court papers regarding the appeal filed in Allahabad High Court by Krishna Giri and others against Jagatguru Shri Mahant Malik Arjun Swami in 1934, Exhibit 20.
11. Ibid., Exhibit No. 11.
12. Ibid., Exhibit No. 16.
13. This farman brought to the notice of Gyan Chandra by S.M. Jaffar, Esqr.
14. Consideration to the sentiments of his subject is clear by his issuing of coins with legend in Bengali script in Assam.
15. The farman is published in the journal of Assam Research Society Jan.—April 1942, pp. 1-12.
16. Memorial submitted to Chief Secretary for India by Jains in 1923.
17. Journal of Bombay University, Vol. I, p. 54.
18. Sir Syed : Maqalat-i-Sir Syed, edited by S. M. Ismail, Vol. X, p. 50.
19. Vide B. A. Dar : Religious Ideas of Syed Ahmed Khan, p. 120.
20. Ibid., p. 131.
21. Quoted in Maqalat-i-Sir Syed, edited by S. M. Ismail, Vol. II, pp. 221-222.
22. Ameer Ali : The Spirit of Islam, p. 172.
23. Ibid., p. 426.
24. Ibid., p. 230.
25. Ibid., p. 232.
26. Ibid., p. 243.
27. Chiragh Ali : The Proposed Reforms, p. XXXVI.
28. Ibid., p. II.

of social progress, and that it should concern itself with spiritualism rather than with the temporal sphere of life. Therefore, they discarded the traditional notion of **Jihad**, **Darul Harb** and **Darul Islam**, and political pan-Islamism. It was the first concerted attempt towards the modernization of Islam in this country.[43]

— —

from the "fatters of Authority and the Dead Hand of the Past".[34] He held that "it would be a merest afront to contend that religious and social systems, bequeathed to us thirteen hundred years ago, should now be adopted in their entirity without the slightest change or alteration ."[35] He did not consider Quran as **Corpus juris civilis** to be accepted for all time.[36] His view was that the subordination of religion to the State is a step forward in the direction of reform and progress.[37]

S. Khuda Bakhsh was a supporter of secular politics. He did not consider the institution of **Khilafat** a basis of the unity of the Muslim world. On the contrary he commented that the abolition of the Khilafat ended a fiction and laid the path open for the development of Nationalism and finally removed once for all the embargo upon liberalism.[38] What is also significant in Khuda Bakhsh was that he opposed the idea of the promotion of Muslim unity in isolation with the Indian solidarity. This makes him politically different from Ameer Ali and Mohsin-ul-Mulk. He wanted that the Muslim solidarity should be merged into a higher, nobler Indian solidarity.[39] Badruddin Tyabji's view were similar to those of Khuda Bakhsh. He also advocated the separation of worldly and financial affairs from religion, and pleaded that in their own interest the religious leaders should keep themselves aloof from all purely financial and mundane matters.[40]

Sulaiman Nadvi, another great scholar, admitted the separation of Church and State in Islam.[41] It is to be noted that the liberals in the last quarter of the 19th century and in the beginning of the 20th Century were guided by scientific developments. Their effort was to decide the validity of the social laws on the basis of science. Mohsin-ul-Mulk declared that "science can submit to no confines or limitations; it is not merely speculative, it is pragmatic, demonstrable and experimental ... . It has confuted the traditional concepts of religion to such an extent that only two alternatives remain : either to allow religion to die a natural death or to interpret religion in the light of the new knowledge."[42] Thus the scientific approach and the ineffectivity of religion in non-spiritual matters should be considered as the foundation of secularism among the Indian Muslims.

For the first time in the history of Islam in India, liberal ideas were propounded that religion should not come in the way

Therefore, law should be in consonance with the exigencies and the requirements of the time.[23]

It is significant that Ameer Ali supported the abolition of polygamy. He regarded it "as much opposed to the teachings of Mohammed as it is to the general progress of civilized society and true cutture.[24] Ameer Ali held that polygamy is abhorrent to the laws of Islam.[25] He also opposed the existing practice of divorce.

"The prophet looked upon the custom of divorce with extreme disapproval and regarded its practice as calculated to undermine the foundations of society. He repeatedly declared that nothing more displeases God than divorce," said Ameer Ali.[26] These ideas regarding the Muslim personal law impel a change which permits polygamy as well as divorce. The change perhaps will be more in keeping with the spirit of Islam than the maintenance of the status quo.

Chiragh Ali's view of Islam was also strikingly secular and liberal. To him.

"Islam as a religion is quite apart from inculcating a social system. The Mohammedan polity and social system have nothing to do with religion.[27] Islam is so sufficiently elastic that it can adopt itself the social and political revolutions going on around it.[28] It is not a barrier to the political, social or moral innovations.[29] Chirag Ali regarded the Prophet primarily as a reformer who supplanted ancient Arabian superstitions by monotheism, elevated the moral standard of Arabs and other people and improved the lot of women by restricting polygamy, discouraging slavery, and abolishing infanticide.[30] To Chiragh Ali, the Mohammadan common law or Shariat is by no means unchangeable or unalterable.[31] The Prophet did not compile any code, but permitted the Muslims to frame any code of Civil or Common law and to found systems which would harmonize with the times and suit the political and social changes going around them.[32] The Prophet, Chiragh Ali believed, never combined the Church and the State into one.[33] The ideas supplement Sir Syed's view on Islam.

S. Khuda Bakhsh also forcefully advocated the separation of religion from social and political life. He attempted to free Islam

Jamaluddin Afghani as well as the protagonists of Hindi-Urdu controversy, a blow to his concept of composite culture.

Sir Syed's legacy of secularism was carried forward by Mohsin-ul-Mulk, Chiragh Alı and S. Khuda Bakhsh. Mohsin-ul-Mulk took Sir Syed's rationalism to its logical end. This was a great encouragement to the secular thinking of a section of Muslims. These religious ideas found expression in one of his letters he wrote to Sir Syed :

"The light and glare of scientific knowledge and enquiry has driven out irrational and obsolete concepts. The modern mind is illuminated by the lustrous and bright ideas and regards such concepts as superstitious and preposterous. And now such irrational and barbarous ideas are hardly amenable to the the sensible and rational mind. Tha only unfortunate victims of such funny superstitions are those who indulge in the luxury of childish talk and heresay.

"Divinity, mercifulness and omnipresence—the qualities ascribed to Supreme Being are all a magnificent humbug. Worship and prayer springs out of fear and apprehensions on the part of the brutes and unlettered. Intuition is but a nightmare. It should better be understood, that the so-called soul or spirit is not immortal. The Day of Judgement is an absurd unreality, Hell and Heaven are concepts without any substance, reward and punishment is the sad work of superstition. Death is the final emancipator of every complication and agony and misery . . Such, for instance, are the reflections of those who are rational, strong of will, and swim in the ocean of sciences."[31]

Even Ameer Ali due to the infiuence of Sir Syed asserted that :

"To suppose, therefore, that every Islamic precept is necessarily immutable is to do injustice to history and to the development of human intellect."[32]

He also argued that certain injunctions of the Quran are historically relevant only to the Prophet's day. It means that Islam as preached by the Prophet is not wholly applicable to all the spheres of life. "According to Ameer Alı, no law is immutable. It becomes out of date after a radical change in the society.

hand the Muslim band of humanist reformers led by Sir Syed Ahmed who set the pace of Muslim renaissance. Sir Syed was a devout Muslim. But he was concerned with the religious and cultural downfall of his community. He found sanction from Islam itself for his progressive and secular approach. He was aware that in India Islam needed a Luther.[18] His secularism and rationalism was based on a saying of the Prophet :

"I am no more than a man; when I order you anything respecting religion, receive it, and when I order you anything about the affairs of the world, then I am nothing more than a man."[19]

He concluded that Islam has nothing to do with wordly affairs. According to him it is wrong to believe that islam is directly related to all worldly matters and that, therefore, nothing can be done without obtaining a religious sanction. The regulations and the laws of Islam should not be identified with Islam itself. They can be replaced by better laws. "It is also wrong", Sir Syed said, "to hold the books of jurists incorporate infallible truth and are sufficient for the guidance of our affairs. Reason is the only weapon which can decide the value of social and moral code of Islam."[20] He held that the principles advocated by Islam are more ethical and are common to all other religions. He vehemently criticised the **Ulema**, who made all the institutions established by the Prophet as a part of Islam.

Sir Syed stood for keeping the political life separate from religion. He asserted that neither the people are required to know the religion of the ruler nor the government should interfere into the religion of the people. Every good government follows this principle. Any government which refused to follow it cannot be described as civilized government. By emphasising this principle, Sir Syed clearly shows that State should not be a religious state and it should not make any distinction between the people on the basis of religion. In the context of India he believed that all the people irrespective of their faith constitute one Nation. Religious difference should not undermine the vital unity of the people. The progress of the people demanded that the leadership should be in the hands of the secular persons. This attitude was responsible for Sir Syed's opposition to the Pan-Islamic movement of

crime was henious, the Rajas demanded exemplary action. Aurangzeb ordered that as the sacred precincts have been despoiled, Lord Vishwanath may be moved to some other place, the temple be razed to the ground and the Mahant be arrested and punished.

Dr. Pattabhi Sitaramayya, in his famous book, "The Feathers and the Stones" has narrated this fact based on documentary evidence. Dr. P. L. Gupta, former Curator of Patna Museum, has also corroborated this incident.

Now, about the demolition of Jama Masjid : The Ruler of Golkunda, the famous Tanashah, after collecting revenues of the State, did not pay his dues to Delhi. In a few years they were accumulated into crores. Tanashah burried this **Khazana** and erected a Jama Masjid over it. When Aurangzeb came to know of it, he ordered the demolition of the mosque. The burried khazana was seized and utilised for the benefit of the people. These two examples are sufficient to show that Aurangzeb did not make any distinction between a temple and a mosque, in the matter of judicial finding.

Unfortunately, the incidents and characters in the Medieval and Modern History of India have been distorted and falsified in such a way that distortion and falsification are being accepted as God's own truth, and an accusing finger is raised against those who try to discriminate between facts and fiction, between reality and distortions, between truth and untruth. The vested communal interests continue to distort and falsify history.

It is most unfortunate that the fundamentalists on both sidas are somewhat busy distorting not only medieval Indian history but also misinterpreting vedic and Quranic tenets and injunctions. Unscrupulous politicians are sowing winds of hatred forgetting that their countrymen will have to reap the whirlwind.

I would humbly draw the attention of such misguided politicians and biased historians to the 19th century band of reformers headed by Rammohan Roy, Mahadev Gobind Ranade, Swami Vivekanand and Ram Krishna Paramhans on the Hindu side, who by their liberal interpretation of Hinduism showed the new generation the human values of religion, and on the other

"Besides this there is a mountain in Junagarh famous as Girnal (Girnar), and there is another hill at Abuji under the jurisdiction of Sirohi. We give these two hills also to Satidas Jawahari of Shrawak community as a special favour, so that he may be entirely satisfied. It is necessary for the officers that they should not allow any one to interfere with these, and no one among the Rajas should obstruct him and they should always help him as such action will bring to them royal pleasure. And they should not demand a new sanad every year, and if any body makes any claim about that village and the three hills, which we have given to him, he will be liable to the censure and curses of the people as well as of God. Another separate sanad has also been given to him.

"Written on the tenth of great Rajab, the Hijri year 1070 (March 12, 1660)."[17]

But there are instances which prove beyond doubt that Aurangzeb did order demolition of Vishwanath temple at Varanasi and the Jama Masjid at Golkunda, and the reasons that were given out for the demolition of the temple and the mosque may give benefit of circumstances to Aurangzeb. The story regarding demolition of Vishwanath temple is that while Aurangzeb was passing near Varanasi on his way to Bengal, the Hindu Rajas in his retinue requested that if the halt was made for a day, their **Ranis** may go to Varanasi, have a dip in the Ganges and pay their homage to Lord Vishwanath. Aurangzeb readily agreed. Army pickets were posted on the five mile route to Varanasi. The **Ranis** made a journey on the **Palkis**. They took their dip in the Ganges and went to the Vishwanath temple to pay their homage. After offering Puja all the Ranis returned except one, the Maharani of Kutch. A thorough search was made of the temple pre incts but the Rani was to be found no where. When Aurangzeb came to know of it, he was very much enraged. He sent his senior officers to search for the Rani. Ultimately, they found that the statue of Ganesh which was fixed in the wall was a moveable one. When the statue was moved, they saw a flight of stairs that led to the basement. To their horror, they found the missing Rani dishonoured and crying deprived of all her ornaments. The basement was just beneath Lord Vishwanath's seat. The Rajas expressed their vociferous protests. As the

granted by our court. Therefore, in the same manner as before we have granted (to the petitioner) the above-mentioned district as a perpetual **In'am.** It is, therefore, incumbent on the present and the future managers of the Subah and the above-mentioned Sarkar, to exert themselves for the continual and permanent observance of this hallowed ordinance (and) to permit the above-mentioned district to remain in possession of the above-mentioned person and of his descendants in the lineal succession from generation to generation, and to consider him exempted from all demands and taxes and all other dues and not to demand from him in raspect hereof a new sanad every year, and they shall not swerve from this order. Written on the 9th of the month of Telk-kand in the Hijra year 1068 (1658)."[18]

The Nagarseth helped Aurangzeb in some war, and being pleased with his services he gave some land-gift at Girnar and Abu to the temples therein. It runs as such :

"In the name of Allah, the compassionate and merciful. (Tughra) O ye Faithful, obey God and obey the Prophet and those in authority among you.

"(Seal) Abul Muzaffar Muhy-ud-Din Muhammad Aurangzeb 'Alamgir Badshah Ghazi.

"At this time, the exalted Farman is issued that since Shantidas Jawahari, son of Sahasbhai, of the Shrawak community has solicited and been hopeful of special favours, and has greatly helped the army during its march with provisions, and expects to be honoured with special rewards, therefore, the village (deh) of Palitana, which is under the jurisdiction of Ahmedabad, and the hill of Palitana famous as Satrunja, and the temple on it, all those we give to the said Satidas Jawahari of the Shrawak community, and the timber and fuel which is to be found on the hill of Satranja should belong to the Shrawak community, so that they may utilise these for whatever purpose they like. Whoever guards the hill of Satranja and its temple should be entitled to the income of Palitana, and they should continue in prayer for the maintenance of the eternal government. It is necessary that the administration and officers and the Jagirdars and the karoris of the present and future should absolutely not allow any deviation or alteration in this.

order to support their claim. But they have a copy of an order issued by Murad Bakhsh, during the reign of his father dated 5th Shawwal 1061 A. H. This order was issued by him on behalf of the Emperor on the petition of one Devanarain, who was the then priest of the Mahakaleshwara temple. Hakim Muhammad Mehdi, the **Waqianawis**, looked into the old records and testified the claim of the petitioner Thereupon, it was ordered that four seers (Akbari) ghee be provided by the **tahsildar** of Chabutra Kotawali for said **deep** of the temple.

The copy of this order was issued by Muhammad Sa'dullah in the year 1153 A.H. i.e., 93 years after the original was issued.

The present priests infer from the issue of the copy after such a long interval that the original order continued to be carried on during all this intervening period which covers the reign of Aurangzeb also. Had this order no worth at this late period, no one would have cared to obtain the copy of a dead letter. Some other royal papers deposited in the archives of the said temple were brought to my knowledge by the then Mahant Lakshmi Narain who also possessed a few papers of the time of Auranqzeb.

Generally historians talk of the demolition of the Chintaman temple constructed by the Nagarseth of Ahmedabad but they rem in dumb on the fact that the same Aurangzeb gave lands for the Shatrunjaya and Abu temples to the same Nagarseth.

The **sanad** granting land to the Shatrunjaya temple runs : "(and) the end of which will be happy. Satidas, the jeweller has represented to that noble, most holy, exalted and elevated presence through persons who constitute the holy assembly of the court, that whereas according to a Farman of His Majesty, the exalted (and) as dignified as Solomon, the protector of the office of the successor (of Muhammad), the shadow of God, dated the nineteenth of the holy month of Ramadan, in the year, thirty-one, the district of Palitana, which is called Satranja in the jurisdiction of the Sorath Sarkar, a dependency of the Subah of Ahmedabad (and revenue of which two lacs of Dams) has been settled as a perpetual **In'am** on the petitioner (and) that he (the petitioner), therefore, hopes that a glorious edict may also be

Assam. This temple and its **Pujari**, were granted a piece of land and the income of some forest for the **bhoga** (offering to God) and the maintenance of the **Pujari** by the Hindu rulers of Assam. When Aurangzeb occupied the province, he immediately issued the said farman confirming the earlier Hindu grant of the land and income in favour of the said temple and its **Pujari**.

The text of the Gauhati Farman runs as follows :

"Be it known to the present and future administrators of important affairs, Chaudharis, Qanoongos, Muqaddams and peasants of patta Bengesar in the Pargana of Pandu in the Sarkar of Dakhinkul that 21/2 **Biswa** of land out of village Sakara, the **Jama** (total revenue) of which was thirty rupees, was settled on Sudaman and his son, the Pujari of Umanand, according to the orders of the previous rulers. At this time the truth of the title (claim) out of the aforesaid maintenance rupees twenty cash out of the **Mahsul** (collections) of the said village and the rest of it...the jungle-land exclusive of the Jama from Intakhali village being settled as the maintenance of the aforesaid grantee it is incumbent upon them (officers) to leave the cash and the land in possession of the above-mentioned perpetually, permanently and for life-time after separating from both the **Mahals** so that they (grantees) may utilise them for their maintenance and **bhog** and engage themsel es in prayers for the continuance of the kingdom to eternity. They shon'd not allow any let or hindrance on account of revenue taxes and other cesses or demand a fresh **Sanad** and if there be they should not rely upon it. Considering this as binding upon them, they should not swerve from it. Written on the 2nd of safar in the 9th year of the Accession of His Majesty."[15]

That Aurangzeb hcd the attitude of tolerance towards Hindus and their religion, is further supported by the priests of the Mahakaleshwar temple at Ujjain. This is one of the chief temples of Siva, where 'deep' light is burnt day and night, continuously without any break. This **deep** is known as **Nanda deep**. Four **seers** of **ghee** used for this **Nanda deep**, was provided by the state from the remote past. And the priests of the temple say that it continued in the Mughal period also; and even Aurangzeb honoured this ancient tradition. Unfortunately they have no royal

we have another farman dated 5th Ramadan 1071 A.H., which refers to this land in following terms :

"The present and future officials of Pargana Haveli, Banaras, subordinate to Subah Allahabad, are to be informed that under the order of the Emperor to the effect that 178 **bighas** of land in pargana Banaras is allotted to Jangams to help in their maintenance. The Jangams have appeared at this time also in the **Darbar** of the Emperor. Their rights are proved and that the same persons are alive and in possession of the land. Therefore, the said land has again been given to them as before as a sacrifice for the head of the Emperor. The said land should be treated as a **mufti** land as detailed below, so that they may utilise it and may pray for the continued existence of the kingdom of the Emperor."[12]

Another land-grant to a Hindu religious preceptor in the town of Banaras was given by Aurangzeb in 1098 A.H. which is as follows :

"At this auspicious time an august farman was issued that as two plots of land measuring 5 8 **dira'**, situated on the bank of the Ganga at the Benimadho ghat, in Banaras (one plot is in front of the house of Ramjivan Gosain and on the bank of the central mosque, and the other higher up) are lying vacant without any building and belong to **Bait-ul-mal** we have, therefore, granted the same to Ramjivan Gosain and his son as **inam**, so that after building dwelling houses for the pious Brahmins and holy **faqirs** on the above mentioned plots, he should remain engaged in the contemplation of God and continue to offer prayer for the continuance of our God-gifted Empire that is destined to last for all time. It is, therefore, incumbent on our illustrious sons, exalted ministers, noble **umras**, high officials, **daroghas** and present and future Kotwals, to exert themselves for the continual and permanent observance of this hallowed ordinance; and to permit the above mentioned plots to remain in the possession of the aforesaid person and his descendents exempt from all dues and taxes, and not to demand from him a new **sanad** every year."[13]

Aurangzeb seems to be very careful to respect the religious sentiments of his subjects.[14] We have a farman of the Emperor issued on 2 Safar of the ninth year of his reign, in favour of Sudaman Brahman, the **Pujari** of Umanand temple of Gauhati in

He dealt severely with the culprits. One of these farmans, refers to a complaint filed in the court of Aurangzeb by the **Jangams** (i. e., the followers of Jangam sect—a Saivite sect) against a Muslim resident of Banaras named Nazir Beg and the imperial order thereon says : "The officials of Haveli Muhammadabad—known as Banaras Subah Allahabad, are to be informed that these days Arjunmal and Jangams, residents of Pargana Banaras, have appeared before (the Emperor) and have made complaint that Nazir Beg, a resident of Banaras, has by force taken possession of five Havelis, which they had in Qasba Banaras. It is, therefore, ordered that if their case is found true and the title of the complainants proved, Nazir Beg should not be allowed to enter the said Haveli, so that in future the Jangams may not appear as complainants before me to seek their redress.

"This farman is dated 11th Sha'ban San 13 Julus (1672 AD)"[10]

The other farman in the possession of the same Math, dated 1 Rabi-al-awwal, 1078 A.H., relates to the restoration of the possession of the land that was granted to the Jangams. It runs :

"All the present and future **Jagirdars** and **karoris** in pargana Haveli Banaras subah Allahabad are informed that according to the order of the Emperor dated 9 Amardad Illahi, 178 **bighas** of land has been granted to the Jangams to help them in their maintenance. The old officials have verified this fact, before this. On the present occasion also they have produced evidence bearing the seal of the **Malik** of the said parganasto the effect that they are, as before, in possession of the land and their title is clearly proved. Therefore, according to the order of Emperor, the same has been left to them as the sacrifice **(Nisar)** for the head of the Emperor. The said land should be returned to them from the beginning of the **kharif** crop of San 10 as it was before and they should not in any way be interferred with, so that these Jangams may utilize the income of every crop in their maintenance of the kingdom of the Emperor. Herein they shall fail not and act otherwise."[11]

This farman does not only show that justice was inherent in him, but also that he made no distinction in distributing the **Nisar** to Hindu mendicants. The said land of 178 **bighas** was in all probability donated to the Jangams by Aurangzeb himself as

the Hindu residents of the town of Banaras and its neighbourhood; and the Brahmin keepers of the temples, in whose charge these ancient temples are; and that they further desire to remove these Brahmins from their ancient offices, and this intimidation of theirs cause distress to that community.

Therefore, our royal command is that, after arrival of this lustruous order, you should direct that, in future, no person shall in unlawful way interfere or disturb the Brahmins and other Hindu residents at these places, so that they may as before remain in their occupation and continue with peace of mind to offer prayers for the continuance of our God-gifted Empire, so that it may last for ever. Treat this order as urgent

This farman is explicitly clear on the point that Auranzeb did not issue any new order against the building of the new temples. He only referred to the practice that was already in continuance and he simply affirms to adhere to that practice. As regards the already existing temples, he is explicitly against their destruction. The farman further shows that he was keen on his Hindu subjects being able to live in peace

It is not the only farman of its type. Banaras has one more farman to show that Aurangzeb was really very keen that the Hindus should be able to live in peace. It runs :

"At this auspicious time an august farman was issued whereas Maharajadhiraj Raja Ram Singh of Ramnagar (Banaras) has represented to the most holy and exalted court that a mansion was built by his father in Mohalla Madho Ram, on the bank of Ganga at Banaras for the residence of Bhagwat Gosain who is also his religious preceptor, and as certain persons harass the Gosain, therefore, our Royal Command is that, after the arrival of this lustrous order the present and future officers should direct that in future, no person shall in any way interfere or disturb the Gosain, so that he may cotinue with pease of mind to offer up prayers for the cotinuance of our God-given Empire, that is destined to last for all time. Consider this as an urgent matter. Dated 17th Rabi, II, 1091 A.H."[9]

Some other farmans with the Mahant of the Jangambari Math, show that Aurangzeb never tolerated any encroachment on the rights of his subjects whether they were Hindus or Muslims.

Dr. P. L. Gupta, the former Curator of Patna Museum they have also been doing research of great historical value on Aurangzeb. It pleased me that there were some other scholar-investigators of truth who were contributing their share in clearing the image of much-maligned Aurangzeb, whom the biased historians have made the symbol of Muslim rule in India. An aggrieved poet has sorrowfully said:

tumheN lEdEkE sArl dAstAN men yAd hai itnA
ke Alamglr hindukush thA, zAlim thA, sitamgar thA !

(i. e., of the thousand year Muslim rule in India they remember only this much that Alamgir was a butcher of Hindus, and a tyrannical and cruel monarch).

While accusing Aurangzeb as an anti-Hindu monarch, much has been made of a **farman**, which is popular by the name of '**Banaras Farman**'. This **farman** belongs to a Brahmin family of Varanasi (Banaras), resident of Mohalla Gauri In 1905 it was produced before the City Magistrate by one Mangal Pandey, son of Gopi Upadhyaya's daughter. It drew attention of the scholars and it was published for the first time in the Journal of the Asiatic Society of Bengal in 1911. And since then it has been often quoted by the historians. Without realizing the real importance of the **farman**, they accuse Aurangzeb of banning the construction of Hindu temples.[8]

This farman was issued by Aurangzeb on 15 Jamadi, I 10:5 A. H. (10 March, 1659) to the local officer of Banaras in disposal of a complaint made by some Brahmin, who was the custodian of a temple and was being harassed by some persons. It runs as follows :

Let Abul Hasan worthy of favour and countenance trust to our royal bounty, and let him know that since in accordance with our innate kindness of disposition and natural benevolence, the whole of our untiring energy and all our upright intentions are engaged in promoting the public welfare and bettering the conditions of all classes, high and low. In accordance with our holy law, we have decided that the ancient temples shall not be destroyed, but new ones shall not be built.

In these days of our justice, information has reached our noble and most holy court that certain persons interfere and harass

by Emperor Aurangzeb. Aurangzeb conferred a **Jagir** and a cash gift on the temple. I felt puzzled. I thought that the **farmans** were fake I was wondering how Aurangzeb, who was known for the demolition of the temples, could confer a **Jagir** on a temple with the words that "the **jagir** was being conferred for the **puja** and **bhog** of the deity"? How could Aurangzeb identify himself with idolatry ?

I felt sure that the documents were not genuine. But before coming to any conclusion, I thought it proper to take the opinion of Dr. Sir Tej Bahadur Sapru who was a great scholar of Persian and Arabic. I laid the documents before him and asked for his opinion. After examining the documents, Dr. Sapru said that these formans of Aurangzeb were genuine. Then he asked his **munshi** to bring the file of the case of Jangum Badi Shiva Temple of Varanasi, of which several appeals were pending in the Allahabad High Court for the past 15 years. The **mahant** of the Jangum Badi Shiva temple was also in possession of various other **farmans** of Aurangzeb granting Jagir to the temple.

It was a new image of Aurangzeb appeared before me. I was very much surprised As advised by Dr. Sapru, I sent letters to the **mahants** of various important temples of India requesting them to send me photostat copies, if they are in the possession of the **farmans** of Aurangzeb, granting them **jagir** for their temples. Another big surprise was in store for me. I received copies of **farmans** of Aurangzeb from the great temples of Mahakaleshwara, Ujjain, Balaji Temple Chitrakut, Umanand Temple Gauhati and the Jain temple of Shatrunjai and other temples and Gurudwaras scattered over northern India. These **farmans** were issued from 1065 AH (1659) to 1091 AH (1685).

Though these are only a few instances of Aurangzeb's generous attitude towards Hindus and their temples, they are enough to show that what the historians have written about him, was biased and is only one side of the picture. India is a vast land with thousands of temples scattered all over. If proper research is made, I am confident, many more instance would come to light which will show Aurangzeb's benevolent treatment of non-Muslims.

In the course of my investigations on the farmans of Aurangzeb I came in contact with Shri Gyan Chandra and

Devanagari characters, the original Kannada, which is full of Sanskrit words, some of these being printed here :

श्रीमत्परमहंसदियथोक्त। बरुदाकिंतादन्था श्रृंगेरी श्री सच्चिदानन्द भारती स्वामी गलवरिये। टीपुसुलतान बादशाह् रवरु सलाम। ता उ बरसि कलुहिसिद पत्रिकेइन्द सकल अभिप्रायक्र तिलियलायितु। ता उ जगद्गुरु वालु सर्वलोकक्कु क्षेम आगबेकु जनरु स्वस्थदल्लि इरेबेकिम्बदागि तपस्सु माडुत्तले इद्दीरी। सरकारद क्षेमवु उत्तरोत्तर अभिवर्धमान आगुवन्ते त्रिकाल तपस्सु माड़वल्लियु ईश्वरप्रार्थने माडुत्ता बरुउद् तम्मनथा दोड्डवरु यावदेश दल्ली इधारयों आदेशिक्के मले बिले सकलवु आगि सुभिक्षवागि इरसक्कदाद्दरिन्द परस्थल दल्लि बहल दिवस ता उ यातक्के इरबेकु होदकेलसवन्नु क्षिप्रदल्लि अनुकूलपडिसिकोंडु स्थलक्के सागिबरुवन्ते माडिसूवद्। तारीख 21 माहे राजीसाल सहर सन् 1220 महम्मद। परिधावी संवत्सरद माघ बहुल 14 लु खत्त सुबाऊ मुनशी हजुर।

"Tipu made lavish gifts of land and other things to Hindu temples, and temples dedicated to Shri Venkataramanna, Shrinivas and Shriranganath located in the vicinity of Tipu's palaces still bear testimony to his broad-minded toleration, and indicate that the great martyr at any rate—for a real martyr he was in the cause of liberty—was not disturbed in his prayers by the Hindu bells calling people to worship the same Allah whose devotee he was. Tipu died fighting for liberty, treating with contempt the suggestion that he should surrender to the enemy. When Tipu's corpse was recovered from among the heap of 'unknown soldiers' whose fate he proudly shared, it was found, that even in death his hand had still clutched the sword which was his instrument for the vindication of liberty. Let us remember the following seasonable words of Tipu : 'Better a lion's life for two days than a dog's life for two hundred years.' and also the lines repeated at the end of each stanza of an elegy composed in his honour : 'Ya Allah, it is better to die beneath the clouds of battle raining blood upon our heads than to live a life of shame and degradation.'"

Similarly, when I was the Chairman of the Allahabad Municipality (1948-53), a case of mutation (**Dakhil Kharij**) came up for my consideration. It was a dispute over the property dedicated to the temple of Someshwar Nath Mahadev. After the death of the **mahant**, there were two claimants for the property. One of the claimants filed some documents which were in the possession of the family. The documents were the **farmans** issued

Tipu Sultan" from a Persian manuscript which was said to be in the personal Library of Queen Victoria. On investigation, it was found that there was no such manuscript in the library of Queen Victoria, and that most of the facts in Col. Miles's history book were concocted and false.

Dr. Shastri's book was approved as a course book of history for high Schools in Bengal, Assam, Bihar, Orissa, U. P., M. P., and Rajasthan. I approached Sir Ashutosh Chaudhary, the then Vice-Chancellor of Calcutta University, and sent him all the correspondence that I had exchanged with Dr. Shastri, with Mysore University, Vice-Chancellor, Sir Brijendra Nath Seal, and Prof. Srikantia, with the request to take proper action against the offending passages in the text book. Prompt came the reply from Sir Ashutosh Chaudhary, that the history book by Dr. H. P. Shastri has been put out of course.

However, I was amazed to find the same suicide story was still existing in the history text-books which had been prescribed for junior High School in U. P. for the students of VI, VII and VIII classes in 1972.

In **YOUNG INDIA**, edited by Mahatma Gandhi, dated January 23, 1930, on page 31 appeared the following item :

"Fateh Ali Tipu Sultan of Mysore is represented by foreign historians as a fanatic who oppressed his Hindu subjects and converted them to Islam by force. But he was nothing of the kind. On the other hand, his relations with his Hindu subjects were of a perfectly cordial nature ...The Archaeological Department of Mysore State is in possession of over thirty letters written by Tipu to the Shankaracharya of Shringeri Math. These letters are written in the Kannada characters.. In one of the letters written to the Shankaracharya in 1793 Tipu acknowledges receipt of the Shankaracharya's letter and requests him to perform **tapas** (i. e. to undergo self-purificatory discipline) and to offer prayers for the welfare and prosperity of his own realm as for that of the whole universe. And finally he asks the Shankaracharya to return to Mysore; for, the presence of good men in a country brings down rain and makes for good cultivation and plenty. This letter deserves to be printed in letters of gold in every history of India, and no apology need, therefore, be offered for reproducing

Now, let me give a few illustrations as to how the historical facts have been distorted.

While I was doing some research on Tipu Sultan in 1728 at Allahabad, some office-bearers of Anglo-Bengali College Students Union approached me with a request to inaugurate their History Association They had directly come from the college with their text-books. Incidentally, I glanced through their history text-book. I opened the chapter on Tipu Sultan. One of the sentences that struck me deeply was :

"Three thousand Brahmins committed suicide as Tipu wanted to convert them forcibly into the fold of Islam".

The author of the text-book was Mahamahopadhyaya Dr. Har Prashad Shastri, Head of the Department of Sanskrit, Calcutta University. I immediately wrote to Dr. Shastri for the source of his information. After many reminders came the reply that he had taken that fact from the Mysore Gazetteer. The Mysore Gazetter was not available either at Allahabad or at the Imperial Library, Calcutta. So I wrote to Sir Brijendra Nath Seal, the then Vice-Chancellor of Mysore University, seeking a confirmation of the statement of Dr. Shastri. Sir Brijendra Nath Seal forwarded my letter to Prof. Srikantia, who was then busy editing a new edition of the Mysore Gazetteer.

Prof. Srikantia informed me that the episode of the suicide of 3,000 Brahmins is nowhere in the Mysore Gazetteer and he, as student of history of Mysore, was quite certain that no such incident had taken place. He further informed me the Prime Minister of Tipu Sultan was a Brahmin, named Purnea, and his Commander-in-Chief was also a Brahmin, named Krishna Rao. He supplied me with the list of 156 temples to which Tipu Sultan used to pay annual grants. He sent me 30 photostat copies of Tipu Sultan's letters addressed to the Jagadguru Shankaracharya of Sringeri Math with whom Tipu Sultan had very cordial relations. Tipu Sultan, as was customary with the rulers of Mysore, daily visited the temple of Lord Ranganatha located inside the fort of Srirangapatnam before taking his breakfast.* Prof. Srikantia suggested that Dr. Shastri might have based his narrations on the so-called "History of Mysore" by Col. Miles, who claimed to have translated his "History of

*Statement made in the Sentence lacks evidence (K.B.L.)

questioned the suitability of applying Muslim law to India. Zia ud-Din Barni, a historian, in his Fatawa-i-Jahandari, says :

"True religion consists in following on the foot-steps of the Prophet. But royal government, on the contrary, can only be carried on by following the policies of Khusro Par.ez and great emperors of Iran".

He admits that : "Between the traditions (**Sunnat**) of the Prophet Muhammad and his mode of life and living, and the customs of the Iranian emperors and their mode of life and living, there is a complete contradiction and total opposition".

But he pointed out that **Shariat**, which is command of God, could be followed in State matters only in exceptional times. Muhammad succeeded in enforcing **Shara** because he was already inspired by God; the first four Khalifas did so because they had been the associates of the Prophet. But prophethood is a perfection of religion and the kingship is the perfection of world fortune. These two perfections are opposed and contradictory to each others, and their combination is not within the bounds of possibility.

Nizam-ud-Din, observes : "Balban gave precedence to the affairs of the State over religion"[4].

Barni states : "In the matter of punishment and exercise of royal authority he acted without fear of God and whatever he regarded to be in the interest of government, irrespective of whether it was in accord with **Shara** or not, he carried into action"[5].

Allaudin Khalji's discussion with Qazi Mughis-ud-Din is well known. His parting reply to the Qazi was : "Whatever I consider to be in the interest of Government, I order. I do not know what the exalted God will do to me on the day of Ressurrection"[6].

Prof. M. Habib says : "It is true that Muslim kings, mostly of foreign extraction sat on Indian thrones for some six or seven centuries. But they could only do so because their enthronement was not the enthronement of the Muslim rule. Had it been otherwise they could not have lasted for a single generation"[7].

State, Wood, in a letter to Lord Elgin said : "We have maintained our power in India by playing-off one part against the other and we must continue to do so. Do all you can, therefore, to prevent all having a common feeling".[1]

George Francis Hamilton, Secretary of State for India, wrote to Curzon, "I think the real danger to our rule in India not now but say 50 years hence is the gradual adoption and extension of Western ideas of agitation, and, if we could break educated Indians into two sections holding widely different views, we should, by such a division, strengthen our position against the subtle and continuous attack which the spread of education must make upon our system of government. We should so plan the educational text books that the differences between community and community are further strengthened".[2]

Cross informed the Governor-General, Dufferin, that : "This division of religious feeling is greatly to our advantage, and I look for some good as a result of your Committee of Inquiry on Indian Education and on teaching material".[3]

Thus under a definite policy, the Indian history text-books were so falsified and distorted as to give an impression that the medieval period of Indian history was full of atrocities committed by Muslim rulers on their Hindu subjects and the Hindus had to suffer terrible indignities under Muslim rule. And there were no common factors in social, political or economic life.

Now let us briefly examine the truth of these allegations. Let us see what the contemporary Muslim historians say : Qazi Mughis-ud Din laments : Although in the medieval period the head of the State in India was a Muslim, the State was not Islamic, the State did not follow the injunctions of the holy scriptures—the Quran, the Hadith, or the laws elaborated in the four schools of Sunni jurisprudence. It is a mistake to call medieval state in India, theocratic, for it did not function under the guidance of the Muslim theologians.

Almost everyone of the Muslim monarchs of India from the 13th century onwards expressed his inability and indicated the impossibility of conducting government in accordance with **Shariat**. Iltutmish, Balban, Allaudin Khalji and Mohammad Tughlaq were among the pre-Mughal sovereigns of India who

who have offered to their Hindu-victims the terrible alternative of conversion or the sword.

It is hardly surprising that educated men in India, drugged with such poisonous stuff from the most impressionable period of their lives, grow up to suspect and distrust each other. The Hindu has been brought to believe that the Muslim period of Indian history, which extends over eight hundred years and more, is a nightmare. Not only does he feel no pride in it, but when he turns back his mind to find inspiration in the past, he skips over this long interval and draws highly idealized picturesof the golden past which lies beyond. The Muslim, on the other hand, having lost the power built-up by his co-religionists to a Christian nation from the West, and being regarded as a mere intruder by the Hindus, naturally feeds his self-respect upon deeds by which he won conquest and glory and completely ignores the remoter past which moulded his cultural achievment of which he sought to be justly proud. How British historians have used these sentiments would be clear from the following quotation from the well-known compilation, Sir H. M. Elliot's "History of India as told by its Own Historians". The passage occurs in the general preface to violume I : "We behold kings sunk in sloth or debauchery and emulating the vices of a Caligula or a Commodus. Under such rulers we cannot wonder that the fountains of justice are corrupted: that the state revenues are never collected without violence and outrage; that villages are burnt and their inhabitants mutilated or sold into slavery; that the officials, so far from affording protection, are themselves the chief robbers and usurpers; that parasites and eunuchs revel in the spoils of plundered provinces; and that the poor find no redress against the oppressor's wrong and proud man's contumely. The few glimpses we have, even among the short extracts of this single volume, of Hindus slain for disputing with Muhammedans, of general prohibitions against processions, worship or ablutions, and other intolerant measures, of idols mutilated, of temples razed, of forcible conversions and marriages, of proscriptions and confiscations, of murders, and massacres and of the sensuality and drunkenness of the tyrants who enjoined them, show us that this picture is not overcharged".

A glimpse into official British records will show how the policy of Divide-et-Impera was taking shape. The Secretary of

banished from all history books for ever. The second classification may be resorted to for convenience of study, especially for the study of culture. But it should be invariably borne in mind that although in the world of thought there may be a temporary division of history for the sake of specialisation, in the world of action history ought to be treated as having a continuous sequence. This, in fact, is the basic idea of history, as any student of historiography will tell us".

Let us consider the facts that are responsible for continuously aggravating disunity, disharmony and disintegration between Indian communities. The underlying primary cause is mis-understanding. This mis-understanding takes many forms and expresses itself in numerous ways. It inspires the interpretation of Indian history and makes it possible for extermists on both sides to press the distortion of historical facts and movements into service to uphold their different theories. The distrust affects our judgement of men and their motives and exaggerates every intentional or unintentional neglect into a deliberatepiece of oppression, and every petty incident of a quarrel or suppression of a breach of law and order into a calculated piece of atrocity. This suspicion colours the whole outlook upon life; every little difference of customs, manners, modes of speech and dress, ways of living and of vocational pursuits is magnified into profound difference of culture, of economic, social, political and spiritual ideals. Is there any wonder that every clash of personal and of group ambition is regarded as a symptom of deep social cleavage and of communal and cultural disharmony ?

The task is not easy, because unfortunately the histories of India which have been taught in our schools and colleges for generations past were originally compiled by European writers. And Indians have not yet succeeded in shaking off the biases inculcated by their European teachers. These so-called histories have produced indelible impressions on the minds of their readers and corrupted the springs of national life. They have laid emphasis on difference, and drawn pictures in which the relations between Hindus and Musalmans bear most prominently the marks of violence, conquest, rapine and religious bigotry. They have presented the Muslims as destroyers of Hindu culture and traditions, despoilers of Hindu temples and palaces, and brutal idol-breakers

arts, which make up the first chapter of our history. Rama and Krishna, Mahavira and Buddha, Chandragupta and Ashoka, Valmika and Vyasa worthily represent the spirit of this culture. The monuments of Sarnath and Sanchi, the paintings of Bagh and Ajanta, the temples of Khajuraho and Bhubaneswar, the dramas of Kalidas and Bhavabhuti constitute the living memory of this glorious age.

The close of this epoch saw the impact of new races – Arabs, Turks and Mughals. The ancient culture of India came into violent conflict with the new-comers, but even before the political struggles had ended, our construction had begun. Islam and Hinduism, which appeared at the start, so antithetical, at last intermingled, each one stirred the profoundest depth of the other and, from their synthesis, grew the religion of **Bhakti** and **Tasawwuf**, the religion of love and devotion, which swept the hearts of millions following different religions and sects of India. The currents of Islamic **sufism** and Hindu **Bhakti** combined into a mighty stream which fertilized old desolate tracts and changed the face of the country. It was in this spirit of India which achieved apparently an impossible task of reconciling the puritanical severity and awe-inspiring transcendence of Islam into the luxuriant fullness and abundance of forms and the intuitive perception of their immanent unity with Hinduism, and created those monuments of architecture and painting, music and poetry and love-inspired religion which are the heritage of Indian history during the middle ages.

A harmonious study of Indian History, a study both wide and deep, seem urgently called for now, more than ever before. The question arises : can we cut up history into little bits, and say : this is ancient history, this is medieval and that is modern history ? The central doctrine of the modern scientific study of history, according to the great Oxford Professor Freeman's teaching, is the unity and continuity of history. The theory is supported by Dr. B. R. Bhandarkar, who says : "We cannot divide history of India into the three water-tight compartments, namely the Hindu period, the Mohammadan period and the British period. Nothing can be more absurd. In the first place they should be either Hindu, Muhammadan and Christian, or ancient, medieval and modern. The first is a communal division of Indian history and should be

In this vast land of ours have dwelt, since time immemorial, peoples of different races and cultures and into this land entered races from beyond the mountains and the seas. But the old inhabitants and the new comers, after they had struggled and fought, eventually forgot their enmities, made peace and joined in thair common endeavour. Each epoch of such a fusion was marked by an efflorescence of culture in which the different elements were so cunningly mixed as to make one whole.

This unity of spirit has ever been conveying to the different groups and communities, which form part of the whole, known as India, the fundamental realization that although the waves upon sea are many and play of winds upon its surface gives rise to varied and even contradictory phenomena like calms and storms, yet the substance of this multiplicity and variety is the unchanging sea.

The socio-economic continuity is the distinguishing feature of Indian history. The harmony found in the many-sided cultures of the people of India stems from this source. Thus although India has many religions, many languages, many races, its fundamental attitudes towards life have persisted through centuries and millennia. It is a remarkable fact that the socio economic structure of India, which originated in the settlements of the Aryans and their assimilation of the pre-Aryan inhabitants of India, continued without any radical change till the nineteenth century.

This unity of her history, her ideals and of her humanity is the living spirit of India. It is geater than any of its particular manifestations in time or in type. It underlines the multiplicity of our creeds and sects, customs and institutions, and art and philosophies. It underlines our historic failures and successes, our struggles and triumphs. It abides in the midst of these changes. It is this spirit which fused the pre-Dravidian, the Dravidian and the Aryan, into that ancient social organism, which found utterance in the sublime philosophies, beautiful crafts, the stirring

Distortion of Medieval Indian History

34 Zia-ud-Din-Barni, Tarikh-i-Firoz Shahi (Text).
35 See Mec eval India Quarterly, op., cit., p. 5.
36 Abul Fazl, Akbar Nama (Translated by Beveridge), Vol. II (Calcutta, 1912), p. 421.
37 Ibid., p. 680.
38 Ibn Hasan, The Central Structure of the Mughal Empire, p.61.
39 Vide Tuper, C.L., Punjab Customary Law s; also R.,Burn, Census of India, 1901, Vol. XVI, Part-I, pp. 92 et. sq.
40 Dr. Beni Prasad, History of Jahangir, pp. 99-100.
41 See Janaraja, Rajatarangini (translated by J. C. Dutt), p. 86; Srivara, Zain Rajatarangini (translated by J C. Dutt), p. 194.
42 The Indian Antiquary, Vol. XXXVI, 1907, p. 8.
43 H. K. Shervani, The Bahmanis of the Deccan (1953 Edition), p. 144, et. sq.
44 M. G. Ranade, The Rise of Maratha Power, p. 31; also John Briggs, History of Rise of Mohammadan Power in India, Vol. III, (Calcutta 1910), pp. 495-6.
45 Jadunath Sarkar, History of Aurangzeb, Vol. II, p. 163, footnote.
46 Tuzuk-i-Jahangiri (Rogger's Translation , Vol. II, p. 181.
47 Tarikh-i-Muhammad Shahi, quoted by G. S. Sardesai, New History of the Marathas, Vol. II, p. 118.
48 Dr. Tarachand, Society and State in the Mughal Period, p. 58.
49 Ibid., p. 59.
50 Mahabharata, Persian Translation (Lucknow Edition), Abul Fazl's preface, p. 15.
51 Ibid., p. 4.
52 British Museum 1883, pp. 239-50.
53 Ibid., 1883, pp. 257-71.
54 India Office MS., 1269.
55 Dr. Tarachand, Patel Memorial Lectures, pp. 60-61.
56 F. Bernier, Travels, op., cit , pp. 155-160.
57 Dr. Tarachand, Society and State in the Mughal Period, p.108
58 Ibid., p. 109.
59 Jadunath Sarkar, Mughal Administration, pp. 129-30.

REFERENCES :

1 Cambridge History of India, Vol. III p. 1.
2 Arab aur Hind Ke Talluqat, by Suleman Nadvi, p 194
3 The History of Medieval India, by Dr. Ishwari Prasad, p. 59.
4 Ibid., pp. 60-61.
5 Cambridge History of India, Vol. III, pp. 89-90.
6 Al-Jahiz, Rasa'il, Vol. II, p. 81.
7 Tarikh Ibn-Yaqubi, Vol. II, p. 105-106.
8 Tarikh Al-Idrisi, p. 169.
9 Tabqat-ul-Umam, pp. 11-15.
10 Tarikh-i-Bukhara, (ed. C. Schefer, Paris, 1892), p. 18.
11 Ibid., p. 19.
12 Neoldeke, quoted in Appendix III, The Iranian Influence on Muslim Literature, pp 150-3.
13 Nicholson, A Literary History of the Arabs, p. 316.
14 The A'in-i-Akbari (Jarret), Vol. III, pp. 7-8.
15 The Hindu Muslim Problem, by Dr. Tarachand, pp. 34-5.
16 Ibid., 35.
17 Ibid., p. 36.
18 Ibid., p. 37.
19 Dr. Tarachand, Society and State in the Mughal Period, 1960. p. 87.
20 Ibid., pp. 90-91; also Priyadas, Bhaktirasabodhini, p. 89.
21 Ibid., p. 90.
22 Ibid., p. 91.
23 Ibid., p. 92.
24 Ibid., p. 92.
25 Ibid., p. 93.
26 Ibid., p. 95.
27 Ibid., p. 96.
28 Dr. Ishwari Prasad, The History of Medieval India, p. 91.
29 Ibid., pp. 110-111.
30 C. V. Vaidya, Medieval Hindu India, Vol. III, p. 361.
31 Ibid., Vol. III, p. 362.
32 Fatawa-e-Jahandari, translated by Prof. M. Habib and Dr. Afzal Begam, Medieval India Quarterly, Vol. III, Nos. 1 & 2, July-Oct., 1957, p. 55.
33 Nizam-ud-Din Ahmad, Tabqat-i-Akbari (Text edited by B. De), Vol. I, p. 82.

endowed with an extremely refined taste in the arts, nurtured both with loving care. Babar laid out beautiful gardens with running water, cascading fountains and marble pavilions. Humayun erected a seven-chambered palace in which each hall was dedicated to one of the seven planets. Akbar created Fatehpur Sikri. Jahangir directed the completion of Akbar's tomb at Sikandra, and the Jahangiri Mahal in Agra. Shahajahan's contribution to India's architectural monuments is well known. The Red Fort in Delhi with its numerous halls, mansions and mosque, the Jama Masjid, and above all, the incomparable Taj Mahal, are immortal witnesses of his taste.

Sir Jadunath Sarkar says : "Two hundred years of Mughal rule, from the accession of Akbar to the death of Mohammad Shah (1556-1749), gave to the whole of Northern India, and much of the Deccan also, oneness of the official language, administrative system, coinage, and also a popular lingua Indica . . Even outside the territory directly administered by the Mughal emperors, their administrative system, official nomenclature, court etiquette and monetary type were borrowed more or less by the neighbouring Hindu Rajas.

"All the twenty Indian Subhahs of the Mughal Empire were governed by means of exactly the same administrative machinery with exactly the same procedure and official titles. Persian was the one language used in all office records, farmans, sanads, land-grants, passes, despatches and receipts. The same monetary standard prevailed throughout the Empire with coins having the same names and same purity and the same denomination, differing only in the name of mint town. Officials and soldiers were frequently transferred from one province to another. Thus the native of one province felt himself almost at home in another province; traders and travellers passed most easily from city to city subah to subah, and all realized the imperial oneness of this vast country."[39]

—:oo:—

had made me acquainted with the nature of man, accustomed me always to refer to first principles and given me a sublime and adequate conception of the Universe, and of the order and regular motions of its parts. I should have been more indebted to you than Alexander was to Aristotle."[56]

Synthesis in Art and Architecture : Most of the Mughal emperors were deeply interested in art. They were both patrons and critics, encouraging talent and guiding skill. They invited to their courts great masters of painting from Central Asia and Persia. They gathered the humble but competent practitioners of art of India. The two worked together and the one was influenced by the other. The result was a style of wondrous beauty. Whatever the subject, the picture is always bathed in clear light, every detail is rendered with immense care, the ground is carpeted with green and trees are in bloom. The mien of the human dwellers in these scenes is one of good cheer, the hearts are elated, heads are held high and the eyes look straight.[57]

The style of painting at the Mughal courts became the prototype of the schools at the courts of provincial governors and of the Hindu Rajas of Rajasthan and the hill States in the Himalayas. Humayun brought with him two pupils of Bihzad, namely Mir Saiyid Ali and Khwaja Abdus Samad. Akbar invited Farrukh Qalmaq and Aqa Raza. But among his artists, there were many Hindu painters of great ability like Basavan, Daswant and Kesho. They were entrusted with the illustrations of works like Shah Namah, Khamsa-i-Nizami, Babar Namah and Timur Namah, as well as the Mahabharat, the Ramayana, Nal Damyanti and Panchatantra. Jahangir carried the art to perfection. He has stated in his **Tuzuk** that he could distinguish between the style of all living and dead painters and could say who the painter of a particular picture was. One of his painters was Mansur who was an expert in painting birds and flowers. Bishandas exalted in portrait painting and Murad and Manohar were unequalled in drawing. Shahajahan maintained the high traditions of his father. The great painters of his reign were Muhammad Nadir Samarquandi, Faquirullah Khan, Mir Hashim, Bishandas and Bichittar. Though the art continued under Aurangzeb, it began to decline rapidly after him.[58]

Painting is the delicate plant and architecture the stately tree that adorn the arbour of culture. The Mughal emperors,

the futility and undesirability of mixing religion with politics. In his **ahkAm** (precepts) collected by Hamid-ud-Din Khan, a favoured officer well known by his sobriquet "dagger of Alamgir" (Nimcha-i Alamgir), the following passages occur : "What have the worldly affairs to do with religion ? And why should bigotry intrude into matters of religion ? For you there is your religion, for me mine (Lakum dinokum wa lia din—Quran)." If the law were followed it would have been necessary to annihilate all the Rajas and their subjects. Another of his precepts was : "What concern have we with the religion of anybody ? Let Jesus follow his own religion and Moses his own."[35]

Aurangzeb blamed his teacher, Mulla Saleh, for his narrow outlook. Bernier reports :

Aurangzeb asked Mulla Saleh : "But what was the knowledge I derived under your tution ?" and complained, "Was it not incumbent upon my preceptor to make me acquainted with the distinguishing features of every nation of the earth; its resources and strength; its mode of warfare; its manners, its religions, its form of government and wherein its interests principally consist; and by a regular course of historical reading to render me familiar with the origin of States; their progress and decline; the events, accidents, or errors, owing to which such great changes and mighty revolutions have been effected ?" He added, "A familiarity with the language of surrounding nations may be indispensable in a king, but you would teach me to read and write only Arabic. Forgetting how many important subjects ought to be embraced in the education of a Prince, you acted as if it were chiefly necessary that he should possess great skill in grammar, and such knowledge of law and of the sciences only through the medium of Arabic ? I have a perfect remembrance of your having, during several years, harassed my brain with idle and foolish propositions, the solution of which yield no satisfaction to the mind, propositions that seldom enter into the business of life. When I left you, I could boast of no greater attainment in the sciences than the use of many obscure and uncouth terms, calculated to discourage, confound, and appal a youth of the most masculine understanding . If you had taught me that philosophy which adapts the mind to reason, and will not suffer it to rest satisfied with anything short of the most solid arguments; if you

possible. Similar opinions prevailed among provincial Sultans of Kashmir, Bengal and the Deccan."[49]

Search For Religious Synthesis : "The Mughals endeavoured to transmute this negative attitude into a positive policy. Babar, before his death, advised Humayun not to distinguish between a Muslim and a Hindu. Akbar's courageous efforts in this behalf are well known. Akbar found that there was no dearth of people in every religion who thought of themselves as perfect, who misinterpreted their religious belief and did not bring the standard work of their religion to the knowledge of the common people. Thus the spirit of the faith remained concealed. Akbar found it essential to prevent the people from falling victims to the nefarious designs of such custodians of faith,and decided that if the standard works of different religions were translated into simple language, they will be able to know the truth for themselves. This would put an end to the monopoly of those who did not state the real spirit of their religion to their respective followers."[50]

Akbar initiated a bold policy so that in his age "the pillars of blind following" were demolished and a new era of research and enquiry in religious matters commenced."[51]

The translations of Sanskrit works prepared in Akbar's reign were illustrated by the court painters. One of the copies of the Mahabharat made for the Imperial Library was in the possession of the Maharaja of Jaipur.[52] Several independent translations of other Sanskrit works were made in the reign of Jahangir, Shahjahan and Aurangzeb, besides the works of Dara Shukoh.[53] Abdul Rahman Chishti (died 1683) gave an Islamizing explanation of the Bhagawad Gita in his mir, **mir, at-ul-haqAiq**.[53]

Several original works on the fine arts, sciences and the philosophy of the Hindus were also written. The most noteworthy is the **tuhfat al-hind** composed by Mirza Muhammad-ibn-Fakhr-al Din Muhammad, in the reign of Aurangzeb, at the request of Kukaltash Khan for the emperor's son, Prince Muhammad Mu'izz-al-Din Jahandar Shah. Jahangir did not depart from the tolerant ways of his father and Shahjahan after some hesitation continued on the whole to follow the same lines.

Aurangzeb s Outlook : Unfortunately, Aurangzeb sought to turn back the hands of the clock. But he too realized ultimately

Akbar, Jahangir, Farrukh Siyar, Sulaiman Shukoh and Sipihr Shukoh took Hindu princesses for their wives. The Hindu royal family of Kachh formed matrimonial alliances with the Muslims.[45]

On the other side, the Hindu was far too ridden with caste inhibitions to receive a Muslim lady in the innermost sanctum of his palace. Yet such instances were not unknown. In Rajauri, Ladakh and Baltistan, Jahangir noticed inter-marriages between the two communities.[46] The love affair of Peshwa Baji Rao I with Mastani is well known. She was a dancing girl who became the Peshwa's constant companion and "accompanied Baji Rao in his campaigns and rode stirrup to stirrup with him."[47]

In 1734 she bore the Peshwa a son, Shamsher Bahadur, who was brought up as a Muslim, the Brahmanas having refused to allow him to enter the Hindu fold. He was killed at Panipat in 1761. He was succeeded in his jAglr by his son Ali Bahadur. In 1787 when Mahadji Sindhia suffered reverses, reinforcements were despatched from the south under the command of Ali Bahadur as the representative of the Peshwa's house.

It was realized by the Muslim rulers on the whole that, in the conditions existing in India, the Islamic laws promulgated for the Arab society of Medina were not strictly applicable. The form of society which the Prophet of Islam envisaged and in which the State was the Church and the Church the State, did not last more than thirty years. The Umaiyads ceased to function as Imams and became merely heads of State. The Abbasids who came after them shed the simple Arab manners, surrounded themselves with pomp and pelf, and introduced in their courts the etiquette, ceremony and splendour of ancient Iran.[48]

In 1258 the Mongol conqueror destroyed the Caliphate, and a new era began in the Islamic civilization. The old concept of a single Muslim society with a single chief disappeared. It need not surprise us, therefore, if we find Muslim rulers and Muslim divines in India differing in their views concerning government and the people. "From the time of Iltutmish, who expressed his inability to follow the advice of the Ulema in the matter of imposing Islam on the Hindus by force, to Balban, Ala-ud-din Khilji, Mohammad Tughlak and Sher Shah, most of them held the view that combination of religion and kingship was not

and all sects of religion with the single eye of favour and not be mother to some and be step-mother to others—he will not become fit for the exalted dignity"[36] Again he adds, "Differences in religion must not withhold him from his duty of watching, and all classes of men must have repose, so that the shadow of God may confer glory."[37] Thus, in the words of Ibn Hasan, "Both Islamic law and Hadith ceased to be the code of government."[38]

The Muslims adopted many Hindu marriage customs, and followed a number of practices which were repugnant to Islamic law; for example, in the matter of fixing the degree of kinship for eligibility in marriage, in prescribing limits of endogamy and exogamy based upon tribal and class divisions, in the observance of ceremonial accompanying the marriage contract. Laws of inheritance were supplanted by custom (urf) in many parts of India. Widow marriage and divorce were frowned upon as among the Hindus.[39]

The various Hindu and Muslim festivals were celebrated with impartial splendour. On the Dasehra, the anniversary of Rama's victory over the demons, the Imperial horses and elephants were arrayed in decorated canopy and paraded for inspection. On the Raksha-bandhan, the Hindu nobles and Brahmins fastened strings on the Emperor's arm. Divali saw gambling in the palace, and Shivaratri was duly observed. Nor were the Muslim 'Id and shab-e-barAt neglected.[40]

Marriages between Muslims and Hindus were rare, but those among the ruling families were well recognized. The Mughal emperors were not the pioneers of this policy. In Kashmir Hindu-Muslim marriages were of a long-standing. Zain-ul-Abedin (1420-70) married the two daughters of Raja Manakdeo of Jammu.[41] Another daughter was married to Raja Jasrath, the Muslim Gakkhar chief.[42]

The Bahmani kings of the Deccan allied themselves with Hindu families. Taj-ud-Din Firoz (1397-1422) married the daughters of Deva Raya of Vijayanagar and Narsingh Rao of Kherla.[43] Ahmad Shah Wali, the ninth Bahmani ruler, wedded the daughter of the Raja of Sonkhed. Yusuf Adil Shah, the Sultan of Bijapur (died AD 1510), took to wife the sister of Mukund Rao, a Brahmana, and she became his chief queen. Amir Barid of Bidar (died AD 1539) followed the example.[44]

who could be taken under Muslim protection as **dhimmis**, they should be asked to accept Islam and in case of refusal put to sword. Iltutmish asked his Wazir to give an answer, and he replied that the request was impossible of execution. So far as Balban is concerned, Nizam-ud-Din the historian observes : "He gave precedence to the affairs of the State (over religion").[33]. Barni states : "In the matter of punishment and exercise of royal authority he acted without fear of God, and whatever he regarded to be in the interest of government, irrespective of whether it was in accord with **Sharia** or not, he carried into action."[34] Alauddin's discussion with Qazi Mughis-al-Din is well known. His parting reply to the Qazi was, "Whatever I consider to be in the interests of Government, and find to be the requirement of the time, I order. I do not know what the Exalted God will do to me on the Day of Resurrection."

Professor M. Habib says : "It is true that Muslim kings, mostly of—foreign extraction, sat on Indian thrones for some six or seven centuries. But they could only do so because their enthronement was not the enthronement of 'Muslim rule'; had it been otherwise, they could not have lasted for a single generation."[35]

Among the Mughal emperors Babar, because he reigned for such a short period, and Humayun, because he was so beset with difficulties, had little opportunity to pay much attention to administrative matters. Akbar inaugurated a State policy which was not subordinated to the dictates of Islam. He treated all religions alike and regarded it his duty to make no difference between his subjects on the basis of religion. He threw open the highest appointments to non-Muslims. He married Hindu princesses and allowed them to retain their religion and perform Hindu rites in the palace. Their sons were successors to the Mughal throne. He eliminated the interference of the Ulema by assuming the authority to give final decisions on religious questions on which their might be conflicting opinions among the **Mujtahids** (Muslim divines). In many social and other matters he showed respect to the sentiments and traditions of his non Muslim subjects. Among these the most important was his abolition of **Jazia** (poll tax on the Hindus). Abul Fazl says, "Kingship is a gift of God And on coming to exalted dignity if he does not inaugurate universal peace (toleration) and if he does not regard all conditions of humanity,

After Shahabuddin the campaigns of Qutubuddin and Iltutmish are described in the self-same strains. But when we prune away the hyperbolic setting we find :

"Qutubuddin and Iltutmish were not fanatical Muslims and were wise rulers who saw the justice and even the wisdom of not interferring with the religion of the people".[31]

Although in the medieval period the head of the State in India was a Muslim, the State was not Islamic. The State did not follow the injunctions of the holy scripture— the Quran, the Hadith, or the laws elaborated in the four schools of Sunni jurisprudence It is a mistake to call the medieval State of India theocratic, for it did not function under the guidance of the Muslim theologians.

Almost every one of the Muslim monarchs of India from the thirteenth century onwards expressed his inability and indicated the impossibility of conducting government in accordance with the Shariat Iltutmish, Balban, Alauddin Khilji aud Muhammad Tughlaq were among the pre-Mughal sovereigns of India who questioned the suitability of applying Muslim Law to India. Zia-ud-Din Barni, the historian, in his Fatawa- -Jahandari says, "True religion consists in following in the footstepsof the Prophet . But royal government, on the contrary can only be carried on by following the policies of Khusrau Parvez and the great emperors of Iran." He admits that "between the traditions (Sunnat) of the Prophet Muhammad and his mode of life and living and the customs of the Iranian emperors and their mode of life and living there is complete contradiction and total opposition." But he points out that the **Shariat**, which is the command of God, could be followed in State matters only in exceptional times. Muhammad succeeded in enforcing **Shara** because he was directly inspired by God, and the first four Khalifas didsobecause they had been the associates of the Prophet. But their successors were faced with two irreconcilable alternatives : traditions of the Prophet and the policy of the Iranian emperors. But "Prophethood is the perfection of religion and kingship is the perfection of worldly fortune. These two perfections are opposed and contradictory to each other, and their combination is not within the bounds of possibility."[32]

Iltutmish was approached by some **Ulema** with the request that as the Hindus were not the people of the Book (ahl-i-Kitab)

Dr. Ishwari Prasad in his History of Medieval India says : "It is not difficult to determine Mahmud's place in history. To the Musalmans of his day, he was Ghazi, a champion of faith, who tried to extirpate infidelity in heathen lands. To the Hindus, he is to this day an inhuman tyrant, a veritable Hu, who destroyed their most sacred shrines and wantonly wounded their religious susceptibilities. But the unbiased enquirer who keeps in mind the peculiar circumstances of the age must record a different verdict. In his estimate, Mahmud was a great leader of men, a just and upright ruler according to his own lights, an intrepid and gifted soldier, a dispenser of justice, a patron of letters, and deserves to be ranked amongst the greatest kings of the world."[28]

After the Ghaznavis came the Ghoris. Their first exploit was the destruction of the city of Ghazni which Mahmud had converted into one of the most beautiful cities in the world. Alptgin followed up his victory and took the city of Ghazni by storm. The finest buildings of the city, exquisite memorials of greatness and splendour of Mahmud, were demolished, and during the seven days the Ghori chieftain remained in occupation of the town "the air from the blackness of the smoke continued as black as night, and these nights, from the flames rising in the burning city, were lighted up as bright as day. Raping and massacre were carried on with greatest pertinacity and vindictiveness, and men, women and children were either killed or made slaves. The dead bodies of all the Sultans of Ghazni except those of Mahmud and Ibrahim were dug out from their graves and treated with indignity and burnt."[29]

The Ghoris next turned their attention to India. The victories of Shahabuddin Ghori are described by Persian chroniclers as victory of Islam, but when the actual facts are analysed, even historians who can in no way be described as partial to the Muslims, form the following estimate of Shahabuddin :

"It cannot be alleged that the religious fervour actuating Shahabuddin and his Mohammadans was stronger than that actuating the Rajputs. Although Mohammadan historians describe the former as making a religious war, Shahabuddin was fighting for conquest of territory and not for extending religion. Indeed we find that conversion of the people to Mohammadanism was not his motive; it was conquering Northern India".[30]

and sought to bring together the masses into a faith which transcended social, intellectual and communal barriers.

Islamic Mysticism : The stirring in the Hindu society had its parallel in the Muslim community. We have seen that Sufism even before its arrival in India had absorbed the main features of Vedanta—for instance the philosophy of absolute monism. The Indian Advaita had become the Muslim **Wahdat-al-Wujud.**

Ibn al-Arabi, the great master of Islamic mysticism, affirms that God is one and the universe is His appearance. Creation is a process of emanation of which the three steps are : (1) the stage of absolute unity (ahadiat), (2) the stage of latent or potential multiplicity (wahdat), and (3) the stage of apparent or actual multiplicity (wahidiat). The multiplicity expresses itself in souls (Ruh), forms (Mithal) and bodies (Jism).[26]

For both, there is a common discipline. It includes purification of self, mastering of passions and desires, filling of the mind exclusively with the thought of God, obtaining control over bodily functions and mental processes till the objective world ceases to distract consciousness, and till man passes away (fana, nirvana) from phenomenal existence and attains union with the divine. The soul stands self-enlightened and unperturbed by temptations and apprehensions.[27]

The Muslim conquest of India was very slow. It took them six centuries to reach the southern confines of India. The invaders came to India in three stages. The first invasion took place in A.D. 712, the invaders being Arabs led by Muhammad bin Qasim. The second set of invasions occurred at the end of the tenth and the beginning of the eleventh century. These were led by Subuktigin and Mahmud of Ghazni who belonged to a Turkish family. The final stage, which led to the establishment of Muslim rule in India, consisted of the invasions of Muhammad Ghori two hundred years later.

Muhammad bin Qasim maintained the dignity of Brahmins and passed orders confirming their pre-eminence. They were protected against opposition and violence. Each of them was entrusted with an office.

reformer was Sant Kabir, who was a powerful exponent of devotional faith centered on an impersonal, transcendental God, and a fearless denouncer of hypocritical and superstitious practices, Hindu or Muslim. Love of God and man was his religion, and he accepted whatever he thought true in Hinduism and Islam[22] There were a number of other teachers whose point of view was similar to that of Kabir and who founded their orders in different parts of the country.

In the Punjab, Guru Nanak founded the Sikh religion which was nourished by his nine successors. The last of them, Guru Govind Singh, transformed Sikhism into a military mission.

In Maharashtra, Namdeo, Eknath, Tukaram and Ramdas were noted saints who were hostile to idol worship, and indifferent towards external acts of religion such as vows, fasts, austerities, pilgrimages, etc. They worshipped Vitthal, the one God who conferred tranquillity, and prayed for release from the snares of the illusory world. They condemned caste distinctions and sought to reconcile Hindu and Muslim faiths.

Bengal had the good fortune to produce Chaitanya, who was a devotee of Krishna but at the same time opposed to the Brahminical system of ritualism and caste. Among his disciples was Thakur Haridas, a Muslim. But there were sects in Bengal which went far beyond Chaitanya in their criticism of Hindu orthodoxy, for example the Kartabhajas.[23]

The Virasaivas or Lingayats of the Kannada region were a sect which came into existence in the twelfth century and rapidly spread in Mysore and the neighbouring districts. Their belief in one God who cannot be represented by images or propitiated by sacrifices, and their rejection of caste, show their independence from the conservative religious ways. They did not approve of sacrifices, fasts, feasts and pilgrimages; nor did they recognize distinctions based on birth. A pariah and a Brahmin were equal as members of the sect.[24]

In the deep South, the Tamil Sidhars rejected the theory of transmigration and the authority of the Shastras. They held that God and love are the same and desired mankind to live in peace, considering love as God.[25]

Thus a powarful religious impulse which drew its inspiration from Hindu as well as Muslim sources, spread all over India

The process of training in devotion implied worship for the Adorable One, sorrow for one's sins, doubt of all objects other than He, celebration of His praise, living for His sake, assigning everything to Him, resignation to His will, seeking Him in all things, renouncing anger, envy, greed and impure thoughts.[21]

The states of emotions and processes bear comparison with what the Muslim Sufis taught in regard to **hal** and **muqam** (states of rapture and stages of ecstasy). For instance, Abu Nasr al-Sarraj, the author of the oldest treatise on Sufism, recounts the seven stages, namely, (1) Repentence, (2) Abstinence, (3) Renunciation, (4) Poverty, (5) Patience, (6) Trust in God and, (7) Satisfaction; and the ten psychic states, namely, (1) Meditation, (2) Nearness to God, (3) Love, (4) Fear, (5) Hope, (6) Longing, (7) Intimacy, (8) Tranguillity, (9) Contemplation and (10) Certainty.

Apart from the founders of the four Sampradayas—Ramanuja, Madhava, Vishnuswami and Nimbaditya—who composed their religious treatises in Sanskrit and the propagators of Vaishnavite Bhakti of the schools of Rama and Krishna, who appealed to the conservative-minded among the general public, there was a third group of mystics who employed the lauguage of the people to preach their radical creeds. They mostly belonged to the lower castes and their movement represents the urge of the unprivileged masses to uplift themselves. Some of them were persecuted by government, some incurred social opprobrium, and others were not regarded as worthy of notice. But they were held in high esteem among the humbler classes who followed their simple teachings with eagerness and understanding. They laid stress upon the dignity of man, for they thought that every individual would reach the highest goal of human life by his own effort. They rejected the claim to special sanctity of priests (Pandits and Maulvis), of books (scriptures of Hindus and Muslims), of temples and pilgrimages, of rites and ceremonies, and encouraged the establishment of direct relation between man and God. The movement arose in the fifteenth century and continued till the middle of the seventeenth.

The leaders of this group hailed from all parts of India, but their teachings manifest the distinct influence of Islam on their beliefs. In the Hindi-speaking region, the most notable

worship. As things are the expression of existence, one out of them must at least be the idol. If the Muslim knew what the idol is, then he would not go astray in his faith. The latter did not see in the idol anything but external creation, and for this reason he became **Kafir** in the eyes of the law. If thou too would not see that reality is hidden in the idol, thou wilt also be not known as a Muslim according to the law."[18]

Islamic mysticism originated and grew in two regions of the Muslim world, ancient Khorasan and Mesopotamia. In both these regions seekres of truth and enlightenment amon the Muslims came into close contact with Indian mystics. The whole of Khorasan was studded with Buddhist monasteries and Hindu temples at the time of the Muslim conqeust as is testified by Hiuen Tsiang who had passed through these lands barely seventy years earlier. In Mesopotamia, Jundeshapur, Damascus, and Baghdad were centres of learning where Hindu scholars taught Indian science and Hindu ascetics (yogis) held debates with Muslim scholars. The **Pramukhas** of the **Nava Vihara** of Transoxiana became the prime ministers *(Baramika)* of the Abbasid Caliphs and they invited Hindu doctors, astronomers and scientists to Baghdad and encouraged the translation of Sanskrit treatises into Arabic. Thus it was that the philosophy of pantheism and the practical discipline of Yoga passed into the Sufi circles of Middle East.[19]

The mystic teachings of Vedanta, on the one hand, inspired Islamic mysticism and on the other, gave birth to the movement of **Bhakti** in India. Ramanuja was the pioneer of this **Bhakti** movement.

The Bhakti Movement : The spirit of Bhakti moved across the country from one end to the other. As Priyadas points out in his **Bhaktirasabodhini**, "The tree of Bhakti was once but a sapling; now it has climbed to the sky with its glory spreadover the earth. Once but a feable thing, now contentedly sways the mighty elephants of the passions."[20]

It was in schools of Rama Bhakti and Krishna Bhakti that the doctrines of mystic practices were developed, and the differentiation of the stages of progress towards unification with God, and of the emotions which accompanied them and the causes that excited and enhanced the emotional states and psychic conditions which followed them, expounded.

Explaining the philosophical aspect of idol-worship, Abul Fazl says : "The inhabitants of this land are religious, affectionate, hospitable, genial and frank. They are fond of scientific pursuits, inclined to austerity of life, seekers after justice, contented, industrious, capable in affairs, loyal, truthful, and constant. The true worth of this people shines most in the day of adversity and its soldiers know no retreat from the field They, one and all, believe in the unity of God; and as to the reverence they pay to the images of stones and wood and the like, which simpletons regard as idolatry; it is not so. The writer of these pages has exhaustively discussed the subject with many enlightened and upright men, and it became evident that these images of some chosen souls nearest in approach to the throne of God are fashioned as aids to fix the mind and keep the thoughts from wandering, while the worship of God alone is required as indispensable."[14]

Long before Europe had learnt to enquire about religion in a scientific and detached spirit, many Muslim learned men had compiled books of comparative religion in which they displayed an amazingly free and rationalistic attitude of mind. Among them was that most eminent scholar Abu Raihan al-Biruni who compiled a comprehensive treatise on Hindus' religions and philosophies as early as the eleventh century.[15]

Throughout the middle ages the Muslims took enormous pains to acquaint themselves with the religious literature of the Hindus. They translated almost all the important texts into Persian—the Vedas, the Upanishads, the Mahabharat, the Ramayana, the Dharma Shastra, Puranas, the Yoga Vasistha, the Yogashastra, Vedanta Shastra, etc.[16]

Among later writers may be mentioned the name of Mirza Jan Janan Mazhar (b. 1699). Mazhar wrote about the Hindu worship of Idols : "In Idol worship, the process is similar to the **Dhikr**, contemplative ritual, which is prescribd for Muslim Sufis."[17]

Mahmud Shabistari (AD 1317), the well-known writer of Gulshan-i-Raz, writing on the theme of idol worship, explains the difference and similarity between it and Islam : "The idol is the expression of love and unity in this world, and to wear the sacred thread is to take the resolve of service. As both faith and unfaith are founded in existence, unity of God is the essence of idol

and conveyed no other meaning. **Buzasaf**, that is, **Budhisattva** was known to them as the founder of Buddhism. Not long ago Buddhism had flourished in Balkh, Transoxiana, Khurasan, Turkistan and Persia, and to some extent also in Iraq, before the Muslims conquered them. After these countries were converted to Islam, the Buddhist priests did not at once stop their preaching. The rosary is one of the objects that Muslims inherited from the Buddhists. The Sufi doctrine of **Fana** is the **Nirvana** of the Buddhists. The whole Sufi system of spiritual **Muqamat** (stations) or **chakras**, that the seeker after illumination realizes on his way to 'extinction', is Buddhistic.

The inhabitants of Balkh and Bukhara had displayed a strong tendency to revert to their old Buddhist habits of thought. Abu Narshakhi (AD 943) relates in his history of Bukhara : "Every time the people of Bukhara were conquered, they accepted Islam, and no sooner than the Arabs retired, they gave it up again."[10]

Twice a year there used to be held a *bazar* in which people sold Buddda's idols. On each market day the sale of idols used to amount to fifty thousand dirhams. Muhammad bin Jafar has recorded that "the *bazar* continued down to our times". (AD 940).[11]

A good number of thinkers amongst Muslims, especially in the Abbasid reign, were more or less directly influenced by Buddhism. Ibn Muqaffa' (AD 760) translated the **Kalilah wa Dimnh** from Pahlavi into Arabic. In his introduction to the Kalilah wa Dimnh he describes an ascetic in the following words : "And I found that divine tranquillity comes over the ascetic when he is absorbed in meditation; for he is still contented, unambitious, satisfied, free from cares, has renounced the world, has escaped from evils, is devoid of greed, is pure, independent, protected against sorrow, above jealousy, manifests pure love does none any harm and remains himself unmolested"[12]

Abul 'Ala-al-Ma'arri, the famous blind poet (AD 933-1058) was a veritable 'Buddhist', nay even a 'Jain'. Von Kramer considers him as one of the greatest moralists of all times whose profound genius anticipated much that is commonly attributed to the modern spirit of enlightenment.[13]

Arab authors have accepted in unambiguous terms the superiority of Indian achievements. Thus Al-Jahiz (A.D. 869) writes: "The Hindus excel in astrology and mathematics. They have a special Indian script. They excel in medicine and possess some wonderful secrets of that art, in particular those remedies that are of the greatest use in the most dangerous diseases. They have developed to a perfection their art like sculpture, painting, and architecture. They are the inventors of chess. They make good swords and know all the tricks of fencing. They know charms that can remove poison and pain from the body. Their music is pleasant and they have all sorts of dances. From India we received that book called **Kalilah-wa-Dimnh.** These people have judgement and are brave. In some virtues they surpass the Chinese."[6]

Yaqubi (A.D. 895) observes: "The Hindus are superior to all other nations in intelligence and thoughtfulness. They are more exact in astronomy and astrology than any other people. The **Brahma Siddhanta** is a good proof of their intellectual powers; by this book the Greeks and the Persians have also profited."[7]

Al-Idrisi (A.D. 1154) speaking of the accomplishments of the Hindus, says: "The Hindus are by nature inclined to justice and never depart from it in their actions. Their good faith, honesty, and faithfulness to their promises are well known, and they are so famous for these qualities that people flock to their country from every side."[8]

Another Arab historian, Quazi Sa'id, observes: "The Hindus have always been considered by all other people as the custodians of learning and wisdom. Their knowledge of God ascertains His unity and purity. To kill or injure an animal is a sin with them."[9]

Influence of Buddhism on Islam: Long before the Muslim scholars translated Hindu works into Arabic or Persian, and before the Muslim travellers brought news from India, the Muslim had some glimpses of India's religious conceptions through Persian literature and also through the Buddhistic influence that still lingered in some of the most remote parts of Iran. They knew the Buddhists as **'Samaniyah'**. The word **'Bud'** or **'But'** had long ago degenerated into the sense of idol worship

"It was certainly possible for Hindus to obtain justice even against Muslims"[4]

It may be conceded at once that the Arab conquest of Sind was an insignificant event in the history of Islam, from the political point of view. But the effects of this conquest upon Muslim culture were profound and far-reaching. When the Arabs came to India, they were astonished, at the superiority of the civilization which they found here. The sublimity of Indian philosophical ideas and the richness of the Indian intellect were a strange revelation to them. The cardinal doctrine of Muslim theology, that there is one God, was already known to the Indian saints and philosophers. The Arabs found that, in the nobler arts which enhance the dignity of man, the Indians far excelled them. The Indian musician, the mason and the painter were as much admired by the Arabs as the philosopher and the man of learning.

Tabari records that Khalifa Harun once sent for an Indian physician to cure him of an obstinate and painful disease. The Arabs learnt from the Indians a great deal in the practical art of administration. The employment of Brahmin officials on a large scale was due to their better knowledge, experience and fitness for discharging efficiently the duties of administration. A great many of the elements of Arabian culture, which afterwards had such a marvellous effect upon European civilization, were borrowed from India. Arab scholars sat at the feet of Buddhist monks & Brahmin pandits to learn philosophy, astronomy, mathematics, medicine, chemistry and other subjects of study. The court at Baghdad extended its patronage to Indian scholarship. During the Khilafat of Mansur (AD 750-774) Arab scholars returned from India to Baghdad carrying with them two books, the **Brahma Siddhanta** of Brahmagupta and his **Khand Khadyaka**. These works were translated by Al Fazari into Arabic with the help of Indian scholars. It was from these two works that the Arabs learnt the first principles of scientific astronomy. There is ample reason to endorse Havell's view that it was India, not Greece, that taught Islam in the impressionable years of its youth, formed its philosophy and esoteric religious ideals, and inspired its most characteristic expressions in literature, art and architecture.

of the military qualities of the Hindus, and the Hindus appeared to have had no repugnance to serving them. Mahmud's son Masud employed Servand Rao in his fight with his brother, and Tilak son of Jai Sen to bring to book Ahmad Nialtigin the rebel governor of the Indian province. Again he raised Hindu troops to fight against the Saljuk Turks, while his successor deputed the Kotwal of Ghazni to recall Bijai Rai a Hindu general to Ghazni from where he had fled on account of some political dissensions.

The conquests of Muhammad Gohri and his general Qutb uddin Aibak were in the nature of a triumphal march made easy by the internecine quarrels of the Rajput princes who then controlled the destinies of northern India. Wihin the interval of less than a quarter of a century the whole of northern India had not only been overrun but brought under subjection. But the establishment of Muslim rule implied little more than the substitution of Hindu Rajas and Zamindars by Muslim chiefs. Sir Wolseley Haig in the Cambridge History of India points out:

"The rhapsodies of Muslim historians in their accounts of the suppression of a rising or the capture of a fortress, of towns and villages burnt, of whole districts laid waste, ...might delude us into the belief that the early Muslim conquest of Northern India was one prolonged holy war waged for the extirpation of idolatry and the propagation of Islam, had we not proof that this cannot have been the case ... . All Muslim rulers in India from Mahmud downwards, accepted, when it suited them to do so, the allegiance of Hindu rulers and londholders, and confirmed them as vassals in the possession of their hereditary lands."[5]

And again, "on this (Hindu) population they (the Muslim rulers) relied not only for the means of support, but also to a great extent for the subordinate machinery of government; for there can be no doubt that practically all minor posts connected with the assessment and collection of the land revenue and with accounts of public and state finance generally were filled, as they were made generations later, by Hindus

"Rebellion and overt disaffection were repressed with ruthless severity, and were doubtless made occasions of proselytism, but the sin was rebellion, not religious error, and there is no reason to believe that the position of the Hindu cultivator was worse under a Muslim than under a Hindu landlord.

"Muhammad Qasim ordered 12 dirhams weight of silver to be consigned to each men, because all their property had been plundered. He appointed people from among the villagers and the chief citizens to collect the fixed taxes from the cities and villages that there might be a feeling of strength and protection."[3]

Muhammad bin Qasim maintained their (Brahmans') dignity and passed orders confirming their pre-eminence. They were protected against opposition and violence. Each of them was entrusted with an office.

Hajjaj, Governor of Iraq, the uncle of Qasim and his immediate superior, wrote to him as follows : As they (Hindus) have made submission and have agreed to pay taxes to the Khalifa, nothing more can be properly required from them. They have been taken under our protection and we cannot in any way stretch our hands upon their lives or property. Permission is given to them to worship their gods. Nobody must be forbidden or prevented from following his own religion. They may live in their houses in whatever manner they like.

He (Muhammad-bin-Qasim) directed the nobles, the principal inhabitants, and the Brahmans to build their temples, traffic with the Muhammadans, live without fear and to strive to better themselves. He also enjoined them to maintain the indigent Brahmans with kindness, observe the rites and customs of their ancestors and give oblations and alms to the Brahmans according to former practice.[4]

The invasions of the Ghaznavides were of the nature undertaken more for the sake of plunder than conquest. Mahmud, whom historians have invested with the character of a religious zealot, had in fact little ecclesiastical fervour. His chief aim was the establishment of an empire from the Punjab to the Euphrates, and his Indian adventures were mainly intended to provide him with the means for the fulfilment of his imperialistic designs, which embraced even the subordination of the Caliph to his will. This explains why he attacked one after another, the great centres of wealth in northern India and never seriously considered the problem of subjugating and ruling the country. A curious light is thrown upon his policy and proceedings by the fact that in his armies which fought on the confines of his dominions, Indian troops formed part of his forces. There is no doubt that the Ghaznavides hed a high opinion

The rise of Islam is one of the marvels of history. In the summer of AD 622, a prophet without honour in his own country, left his native city to seek asylum in the town of Yathrib—since known as Madinat-un-Nabi, 'the city of the Prophet', more than two hundred miles north of Mecca, the town which had cast him out. Little more than a century later, the successors and the followers of the fugitive, were ruling an empire, which extended from the Atlantic to the Indus and from the Caspian to the cataracts of the Nile, and included Spain and Protugal, some of the most fertile regions of southern France, the whole of the northern coast of Africa, upper and lower Egypt, their own native Arabia, Syria, Mesopotamia, Armenia, Persia, Afghanistan, Baluchistan and Transoxiana.[1]

It was in AD 711 that the first Muslim invader, Muhammad bin-Qasim, crossed the sea, defeated Dahir, and laid the foundation of the first Muslim Kingdom in Sind. When the Arab commander reached Alor, the citizens resisted the invaders vigorously for several months. Then they sued for peace, insisting on two conditions : one, that no resident of the city be killed, and two, that there should be no interference with their places of worship. Muhammad bin Qasim in accepting these terms said : "The temples of Hindustan are like the churches of Christians, the synagogues of Jews and the fire-temples of the Magians."[2]

Regarding the invasion of Sind two things may be noted : (i) that the oppression of the native rulers was the prominent cause of the success of the Arabs; and, (ii) that apart from the slaughter and plunder during the actual course of war, the moment victory was won and peace concluded, a mostenlightened policy of administration was followed which stands in shining contrast to the deeds narrated in the contemporary European history. Here are some of the Qasim's orders :

The Confluence of Islam and Hinduism

Khuda Bakhsh Annual Lectures, 1985

Khuda Bakhsh Annual Lectures
are delivered every year
by some eminent scholar of
Persian, Arabic or Islamic
Studies.

Mr. Qazi Abdul Wadood,
Dr. Zubayr Siddiqi,
Prof. A. A. A. Fyzee,
Prof. Nazeer Ahmad,
Dr. Hashim Amir Ali,
Dr. Bruce B. Lawrence,
Prof. S. Vahiduddin,
Prof. M. S. Agwani,
Prof. S. Nurul Hasan,
Mr. Badr-ud-Din Tyabji and
Mr. Saiyid Hamid
were the forerunners
in the series to which
Mr. B. N. Pande
contributed in 1985.

Khuda Bakhsh Annual Lectures, 1985

ISLAM
AND
INDIAN CULTURE

Mr. B. N. PANDE
Governor, Orissa

CONTENTS

Printers : Liberty Art Press, New Delhi and Patna Litho Press, Patna
Publisher : Mahboob Husain for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone 50109)
Editor : Dr A. R. Bedar
Annual subscription : Rs. 60.00 (Inland), 12-00 Dollars (Asian countries), 24 Dollars (other countries) Rs. 15-00 per copy

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL



44

1987

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
PATNA

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

44



Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna